نہ دل کو راہ پے لائے

ناولٹ

کنیز نبوی

کنیز نبوی

[illegible]

اس نے تو اب تک زندگی میں محبت کو ہمیشہ مہربان ہی دیکھا تھا مگر اس لمحے جب زندگی کی بساط پر محبت کے مہروں نے ہجر، جدائی اور بچھوڑے کی چال چلی تو اسے پہلی بار پتا چلا کہ محبت ظالم بھی ہو سکتی ہے۔

اس نے دھندلائی نظروں سے دور ہوتی عنیزہ عارف کو دیکھا جو اسے ناکردہ گناہ کی سزا سنا گئی تھی۔ سیف مصطفیٰ نے آنکھیں موند کر نمی کو اندر دھکیلا اور لب بھینچ کر ہاسٹل سے باہر نکل آیا۔ واپسی کا سفر ہمیشہ تھکا دینے والا ہوتا تھا مگر آج

ناولٹ



سرشاری بھی ہوتی تو اس کے رگ و پے میں دوڑتی رہتی مگر آج وہی کامطمئنہ نڈھال کر دینے والا احساس پھر عارضی نہیں ہمیشہ ان کے بیچ ڈیرا ڈالنے کی تیاری پکڑتے ہوئے تھا۔

سیف مصطفیٰ نے ہمیشہ کی طرح گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے سر اٹھا کر اوپر دیکھا جہاں ایک جو دل فریب اور ادائی مسکراہٹ ہمیشہ موجود ہوتی۔ مگر آج تو ہلتا ہوا ہاتھ تھا نہ آنکھوں میں ملن کی آس لیے مسکراتے ہوئے ہونٹ وہ خوب صورت وجود کہیں بھی نہیں تھا اسے اچانک پردہ ہلتا ہوا نظر آیا اور ایک دھندلا سا سایہ۔

"نہیں پردہ تو ہوا سے بھی ہل سکتا ہے اور سایہ میرا وہم ہو سکتا ہے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس کی آنکھوں میں چبھتی نمی اب گالوں پر پھیل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور جب اس نے ہمیشہ کی طرح مڑ کر دیکھا تو اس کے عنیزہ عارف کا دل چاہا۔ وہ سامنے آ کر اسے چلا کر رک جانے کو کہے اور ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے بیٹھ کر خود سے کیا ہوا اقرار دہرائے۔

"سیف مصطفیٰ! مانا کہ تم اس معاشرے کے مرد ہو مگر میں عورت کی ازلی وفا کی وارث تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی کہ عورت کی یہی کمزوری ہے۔ وہ جانتی نہیں پوچھتی ہے اس کا محبوب عام سا مرد ہو کر بھی اس کے لیے دیوتا کا درجہ رکھتا ہے اور یہی لغزش خیال اس کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔"

مگر اس سے پہلے کہ وہ سیف مصطفیٰ کو بلاتی اس کی نظر صائمہ کی میز پر پڑی اور اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔ ٹیبل پر پڑے پھول جو مرجھا چکے تھے صائمہ کے وجود کی طرح۔ آنسو اس کے رخساروں پر بے تو بکھرے خطوط کھلی ہوئی ڈائری کے پھڑپھڑاتے ورق سارے منظر واضح ہونے لگے۔

وہ سیف مصطفیٰ کو بھول گئی۔ اپنی محبت کی تپسیا کو بھول گئی۔ بھول گئی یہ بات بھی کہ وہ محبت کی پجارن تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے صائمہ جبیں کی ادھ کھلی آنکھیں بھینچے ہوئے ہونٹ اور ابھرا ہوا جسم جو سفید چادر میں بھی نمایاں تھا۔

اس کی سسکیاں آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئیں۔

"نہیں، نہیں سیف مصطفیٰ! میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتی تم بھی تو اس معاشرے کے مرد ہو تمہارے اندر کا مجھے کیا پتا۔ جگنو کے سپنے آنکھوں میں سجانے والی بھولی بھالی لڑکیاں کیا جانیں شکاریوں کی نیت کا فتور۔ ہماری یہ بے علمی ہی تو ہمیں کھا جاتی ہے۔" اس نے اضطراب سے سر تکیے پر پٹخا اس کی آنکھوں میں ماضی کا ایک ایک عکس روشن تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دن بڑا خوشگوار تھا جب وہ اماں جان اور بابا جان کی خواہش پر ایل ایم سی جامشورو میں داخلہ لے کے آئی تھی۔ حیدرآباد سے واپس گاؤں پہنچی تو اماں اس خبر سے ہی نہال ہو گئیں کہ اس کی بیٹی کو میڈیکل میں داخلہ مل گیا ہے۔ وہ اسے خوشی سے چومتی اور بات بے بات مسکرائیں تو رئیس عارف نظامانی دیکھ کے مسکرا دیے تب عنیزہ عارف دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر باپ کو شرارت سے دیکھتی اس سے پہلے کہ وہ ہمیشہ کی طرح کہتی۔

"بابا جان مکمل کر لیجیے۔" رئیس عارف قہقہہ لگا کر ہنس پڑے جیسے شرارت کرتے پکڑے گئے ہوں۔

اور اس نے ہمیشہ کی طرح ہنستے ہوئے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"بابا! آپ اماں کی باتوں پر یوں چپکے چپکے مسکراتے ہیں بہت اچھی لگتی ہیں نا اماں آپ کو؟"

"ظاہر ہے عمر گزاری ہے اس کے ساتھ۔" رئیس عارف نظامانی کے لبوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو جاتی۔

"بہت چاہا ہے نا آپ نے اماں کو۔ ہے نا بابا؟" اس نے شرارت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"اڑی وڈی تھی گئی ہے پر پیو نال چونبڑی رہندی اے۔ اصل ڈھٹی جو ڈھی۔" (اتنی بڑی ہو گئی ہے باپ کے ساتھ چپکی رہتی ہے اصل گدھے کی گدھی) عائشہ بیگم باتوں پر جز بز ہو کر رہ گئیں۔

"بابا دیکھیں اماں میکوں کیا کہندی پئی اے۔" اس نے منہ بسور کر کہا تو رئیس نے ہنس کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔

"آپ کی یہ جانب داری مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔" عائشہ نے بگڑ کر کہا۔

"تمہاری ماں سے اختلاف نہیں کر سکتا۔" بابا نے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اپنے دل پر رکھی۔

"بابا اماں آپ کی چچا زاد تھیں اور آپ کے ہی گھر رہتی تھیں دادا نے ہی پرورش کی پھر آپ دونوں کے بیچ کوئی ظالم سماج نہیں تھا نا؟" اس نے چپکے سے باپ کے کان میں کہا تو رئیس عارف ہنس کر دھیرے سے بولے۔

"ہمیں بیٹا! اسی سے ڈر لگتا تھا۔"

"سوہنی ویکھ کیا کھسر پھسر کریندی پئی ہے پیو دے کن وچ۔" (سوہنی یہ کیا کھسر پھسر کر رہی ہو باپ کے کان میں۔) ماں نے کہا تو اس کے بھائی نے بھی چھیڑا۔

"بابا سوہنی کیا کہندی پئی ہے سنا۔"

"دیکھ فیروز خان! میڈی دھی کو تو کجھ نہ کہہ۔ نت میں تیڈا دانا پانی بند کر چھوڑساں۔" رئیس عارف نے ہنستے ہوئے بیٹے کو دھمکایا۔

"بابا! ایویں تو نہ کہہ ایہاں دے ساہمنوں۔ اسے پہلے ای سر چڑھ گئی ہے۔" (بابا یوں تو نہ کہیں اس کے سامنے یہ تو پہلے ہی سر چڑھ گئی ہے۔)

"میڈی خواہش تو دھی نے پوری کیتی اے نا فیروز!"

"میڈا پتر بھی ایڈی زمیناں سنبھالدا اے کوئی نکا کم اے۔" (میرا بیٹا بھی اتنی زمینیں سنبھالتا ہے یہ کوئی چھوٹا کام ہے) اس کی ماں نے جلدی سے لقمہ دیا۔

"دیکھیں بابا! ماں کو تو ہر صورت بھائی ہی اچھا لگتا ہے۔" اس نے شکایت کی تو وہ ہنس پڑے۔

"تیڈی ماں کے سمجھانے وچ میں [illegible] سکدا۔ میڈی مجبوری ہے نا۔" وہ باپ کے کہنے پر کھلکھلا کر ہنسی۔

"مامی عائشہ! اساکوں مبارکاں ہوون کیلے دھی کو میڈیکل وچ داخلہ مل گئے۔" اڑی ناہید بھی خبر سن کر آ گئی تھی۔

"بابا اڑی اجے [illegible] مبارکاں۔" وہ ہنس کر اس کے گلے لگیں۔

"اڑی ناہید جھلی کر۔" رئیس عارف نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"ادا بھلائی کر آج میں بھی مٹھائی کھا کر جاؤں گی۔"

"بابا اڑی ایویں نہیں۔ ڈھیروں مٹھائیاں۔ میں ابھی فیروز کو مانگی بھیجتا ہوں مٹھائی لینے مگر اڑی آج ہمارے ہاں صرف مٹھائی نہیں روٹی بھی کھا کر جانا۔ عائشہ اڑی کی پسند کی چیزیں فیروز کو بتا وہ لے آئے۔"

"مامی عائشہ! دیکھ آج تو ادا عارف بڑا خوش ہے۔" ناہید نے کہا۔

"اڑی! وہ ہی تو میرے بچے ہیں ان کی خوشیوں میں خوش نہیں ہوں گا تو پھر کن کی خوشیوں میں خوش ہوں گا۔"

"ہاں ادا! تو ہی تو میرے بھائی ہو پھر تمہاری اولادیں بھی دو اور وہ جو گیا تو پھر لوٹ کر نہ آیا اس کا بھی ایک وانہ ہے۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔ بابا کے تو دو ہی پوتے ہوئے نا۔" ناہید نے گہری سانس لی۔

اس نے دیکھا۔ بابا ایک دم چپ سے ہو گئے اور اماں کب کی وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔

اور جب وہ اسے ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں چھوڑنے آئے تو اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"بابا! اس شہر میں چاچا بھی تو رہتے ہیں۔ آپ اگر دوسرے ہاسٹلز سے مطمئن نہیں تھے تو مجھے وہاں بھی چھوڑ سکتے تھے۔"

عارف نکالا؟" جو لیے چپ سے ہو گئے۔
"اس نکالا اس نے ہمارے ساتھ کوئی تعلق سرے سے نہیں، پھر میں تجھے کیسے وہاں چھوڑ آتا۔"
"مگر بابا! آخر چاچا نے ہم سے تعلق کیوں توڑا؟" زندگی میں پہلی بار ہمت کر کے اس نے پوچھ لیا۔
"بس بیٹا! کچھ لوگ ہوتے ہی سر پھرے ہیں۔ ہم ان کو کیا کہہ سکتے ہیں۔" اسے لگا وہ اسے ٹال رہے ہیں پھر وہ خاموش ہو گئے۔
"ٹھیک ہے بیٹا اب تم جاؤ اوپر اپنا کمرہ دیکھو میں بھی میڈم حمیدہ سے مل لوں۔ اور ہاں پھر آفس آنا کہ میں میڈم حمیدہ سے تمہارا تعارف بھی کروا دوں۔"
وہ ایک تین منزلہ بنگلہ تھا۔ جس کی دو اوپر والی منزلوں کے کمروں میں بیڈ ڈال کر ہاسٹل کا درجہ دیا گیا تھا۔ نیچے والے پورشن میں میڈم حمیدہ کا بیڈ روم، آفس اور ڈرائنگ روم تھا۔ جس میں ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیوں سے ملنے والے بھی آکر بیٹھتے اور جس کو لڑکیاں مشترکہ ڈرائنگ روم کہتیں۔ باقی کے دو کمروں میں ایک میڈم حمیدہ کا گیسٹ روم تھا۔ جس میں کبھی کبھار ان کے مہمان آکر رہتے تھے کیونکہ میڈم حمیدہ مفت میں مہمان داری کی قائل نہیں تھیں اور اک کمرے میں بڑا سا ٹی وی رکھ کر اسے ٹی وی لاؤنج کا نام دیا گیا تھا۔ اس ٹی وی لاؤنج میں بھی لڑکیاں شاذ و نادر ہی آکر بیٹھتیں اس لیے کہ میڈم حمیدہ کا مزاج پل میں تولہ پل میں ماشہ تھا۔ اکثر ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیاں اس بات کا خیال رکھتیں کہ ان کا سامنا کم سے کم ہو البتہ
میڈم حمیدہ کا رویہ ملازموں سے بڑا اچھا رہتا کیونکہ وہ خوش دلی کا مظاہرہ کر کے پیسہ کم دیتیں اور کام زیادہ لیتیں۔ وہ اس ہنر سے واقف تھیں کہ کام پڑنے پر گدھے کو باپ کیسے بنایا جاتا ہے۔ البتہ وہ ہاسٹل کی لڑکیوں پر بڑا سخت پہرہ رکھتیں۔ کون کس وقت یونیورسٹی سے فارغ ہوئی ہے۔ کس کی کس پیریڈ کا کیا وقت ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ذرا دیر ہوتی تو آتے ہی وہ آفس کی کھڑکی سے سر نکال کر دبوچنے والے انداز میں استفسار کرتیں۔
"میڈم! راستے میں دیر ہو گئی۔ ٹریفک جام تھی یا راستے میں بس خراب ہو گئی۔" آنے والی بھیگی بلی بنی صفائی پیش کرتی۔
جواب دے کر یوں بھاگتی کہ پیچھے سے بے چاری میڈم کو غصے سے "ہونہہ" بھی زور سے کرنا پڑتی تاکہ وہ بھی سن لیں۔
اور کمرے میں آکر وہ لڑکیاں ان کا ریکارڈ لگاتیں اور طرح طرح کے نام رکھ کر دل کی بھڑاس نکالتیں۔
اس کے ابتدائی دن تو سکون سے ساتھ گزر گئے۔ اس کی روم میٹ جو ابھی چھٹیوں پر گاؤں گئی ہوئی تھی۔ البتہ اسے یہ فکر ضرور تھی کہ نہ جانے وہ مزاجاً کیسی ہو اور اس کے ساتھ وہ گزارا کر بھی سکے گی یا نہیں لیکن۔ ہاسٹل کی دوسری لڑکیوں نے سائمہ جبیں کا ذکر اچھے لفظوں میں کیا تو اسے کچھ اطمینان ہوا۔

☆ ☆

کتنے ہی ماہ بیت گئے۔ اندھیرا صرف اس کے کمرے میں ہی نہیں اس کی زندگی میں بھی در آیا تھا۔ پچھلے تین مہینوں سے سیف مصطفیٰ جو اوندھے منہ پڑا تھا تو کروٹ بھی نہیں بدلی تھی۔ وہ یوں سکتے کے عالم میں پڑا تھا کہ دل کی دھڑکن کی آواز اسے واضح سنائی دینے لگی جیسے وہ بھی سینہ کوبی کر رہی ہو۔
اس کا سارا جسم انجانے درد سے دکھ رہا تھا۔
"وہ میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتی ہے؟ کیسے کیسے یقین کر لوں اس کے لفظوں پر۔ کیا میری محبت اتنی کمزور تھی کیا میری طلب میں کوئی کھوٹ تھی؟ میں نے تو محبت کو پوری سچائی سے برتا تھا پھر۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا عنیزہ عارف! کیوں کیا تم نے ایسا؟" اس کے دل میں اسی سوال کی ہوک تھی اور کانوں میں اس کی آواز۔
"تمہیں کیا پتہ سیف مصطفیٰ! میرا اعتبار کرچی کرچی ہو گیا ہے۔ تم بھی تو اس کے دوست ہو اس کے نقش قدم پر ہی چل سکتے ہو۔ اب میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتی اس لیے کہ جہاں بے اعتباری کا موسم در آئے وہاں محبت ہار جاتی ہے۔ اس لیے تمہارے اور میرے راستے جدا ہو چکے ہیں۔"
اور سیف مصطفیٰ کو یقین نہیں آیا تھا کہ عنیزہ عارف اس کے ساتھ یوں بھی کر سکتی ہے۔ بغیر کسی صفائی کے اسے وضاحت کا موقع دیے بغیر قرار دے کر اسے سزا سنا دے گی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اس وقت وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ۔
"نہیں عنیزہ عارف! تم مجھے صرف اک مرد ہونے کی سزا نہیں دے سکتیں۔" وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ "محبت کے ان دو سالوں میں کبھی بھی میں نے کوئی ایسی اوچھی حرکت کی ہے عنیزہ عارف! کہ جس سے سیف مصطفیٰ کی ہوس جھلکنے لگے۔" مگر وہ سکتے کے عالم میں کھڑا اسے سنتا رہا تھا۔
وہ صرف فیصلہ سنانے کے لیے آئی تھی اور سنا کر چلی گئی اور وہ اپنے خوابوں کی راکھ اٹھاتے بمشکل ڈرائیونگ کر کے گھر پہنچا تھا اور تب سے بے سدھ پڑا تھا۔
اس سے پہلے اس کا ذاتی ملازم اسے تین بار کھانے کا پوچھنے آیا تھا۔ مگر ہر بار وہ کہتا۔
"خان! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔
"سیف۔۔۔ سیف بیٹا!" غلام مصطفیٰ اندر داخل ہوئے تو اس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ انہوں نے سوئچ بورڈ کا بٹن ڈھونڈا! اگلے ہی لمحے کمرہ روشن ہو گیا۔
"سیف!" انہوں نے غور سے دیکھا۔ اوندھے منہ پڑے ہوئے اس کے وجود میں اس پکار پر کوئی جنبش نہ ہوئی تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس کے بیڈ پر بیٹھے۔
"سیف بیٹا! طبیعت ٹھیک ہے؟" انہوں نے اس کا شانہ تھپکا۔
"سیف۔۔۔!" ان کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔ انہوں نے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ موڑا تو اس کا وجود شدید گرم محسوس ہوا۔ انہوں نے ایک دم گھبرا کر اسے سیدھا کیا۔ سیف مصطفیٰ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کا سارا وجود جل رہا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر ملازم کو آواز دی۔ خان محمد دوڑا دوڑا آیا۔ وہ اس کی مدد سے اسے اسپتال لے گئے۔
"کوئی بات نہیں رئیس غلام مصطفیٰ! پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بخار اتر جائے گا۔" ڈاکٹر عبدالقادر نے انہیں دلاسہ دیا۔
"مگر وہ ٹھیک تھا۔ پھر اچانک اس کی یہ حالت۔۔۔"
"رئیس آپ بچے ہیں احتیاط نہیں کرتے۔ تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔" ڈاکٹر عبدالقادر نے مسکرا کر ان کا شانہ تھپکا۔
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو یا صرف مجھے دلاسہ دے رہے ہو؟" انہوں نے مشکوک نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔
"یہ تمہاری شک کرنے کی عادت نہیں گئی۔ ارے یار! کبھی تو اعتبار کرنا بھی سیکھو۔ میں ڈاکٹر ہوں بچپن سے اس کا علاج کر رہا ہوں۔ یہ ہمیشہ بے احتیاطی کی وجہ سے بیمار ہو جاتا ہے۔ چلو آج رات تمہارے اطمینان کے لیے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کر لیتے ہیں۔"
"ہاں یہ صحیح ہے۔" انہوں نے فوراً تائید کی۔
پھر وہ ساری رات ماضی کی گرد جھاڑتے رہے۔
"سر! آپ لیٹ جائیں۔ ہم ہیں نا پیشنٹ کا خیال رکھنے کے لیے۔" ڈیوٹی ڈاکٹر نے ان سے کہا۔
"نہیں مجھے نیند نہیں آ رہی۔" انہوں نے سہولت سے منع کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔
اور ماضی کا اک خوب صورت منظر ان کے سامنے

ان کے
[illegible] گول وہ ہو گئے ان کے [illegible] تھی۔ انہوں نے اسے
[illegible] شادی اور بیل دی [illegible]
[illegible] شروع کیا تو وہ ان کی بیوی بول
اٹھیں۔
"ارے ارے کیا کرتے ہیں آپ چھوٹے بچے کو
[illegible] نہیں ہوتے۔"
"نہیں ہوتے؟"
اور جب انہوں نے ڈرائیور کو مٹھائی دے کر
بھیجا تو ان کی ماں دوڑی دوڑی آئی تھیں۔
"گاؤں میں تیرے بیٹے کے لیے کیا لائی ہوں۔"
پوپلے منہ [illegible] انہیں دکھائیں اور وہ خوشی سے نہال ہو
گئیں۔
"اماں آپ کو کیسے پتا تھا کہ میرے یہاں اولاد ہونے
والی ہے؟"
"ارے پاگل اماں بھی کبھی بچوں کی خوشیوں
سے بے خبر ہوتی ہے بھلا۔" وہ سادگی سے ہنسیں۔
"غلام مصطفیٰ ابھی تیرا حصہ الگ نہیں دوں گی۔
میں تیری بیوی کے لیے زیورات بھی لائی ہوں جو تیرا
حصہ بنتا تھا۔ میرے لال اب ضد چھوڑ دے چل کر باپ
کو منا لے۔"
"اماں آپ کے کہنے پر ہر بار میں جاتا ہوں، مگر ہر
بار ابا کہتے ہیں 'میرا ایک ہی بیٹا ہے جو میرے ساتھ
رہتا ہے' تو پھر میں کب کا ناتا توڑ چکا۔ اب آپ
بتائیں میں کیا کروں۔"
"ہاں تمہارے باپ کی ضد بڑی خراب ہے۔ وہ
مجھے بھی تھوڑی آنے دے رہے تھے، مگر بیٹا میں نے
سامان باندھا اور آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ تیرے باپ کو
میں نے صاف کہا اب اگر آپ مجھے گھر سے نکالیں بھی
گے تو بھی میرے غلام مصطفیٰ کا گھر ہے۔ وہ وقت
کی روٹی ضرور کھلائے گا مجھے۔ بس اب نہیں رکوں
گی۔ شکر ہے تو نے گاڑی بھی بھیج دی تھی۔" وہ مسرت
سے بولیں۔
"اماں یہ میرا نہیں آپ کا گھر ہے۔ اس پر آپ کی
حکومت چلے گی۔" وہ ماں کی ٹانگیں دبانے لگے تھے۔

اور وہ جتنے دن رہیں، ساس بہو کی خوب بنی۔ مریم
بڑے شوق سے ان سے گاؤں کی باتیں پوچھتی۔
کچھ دن بعد پھر وہ گئیں تو ایسی گئیں واپس لوٹ کر نہیں
آئیں۔ انہوں نے کئی بار ڈرائیور کو بھیجا مگر وہ ہر بار
کہتیں میں آؤں گی کسی دن۔ مگر اس دن سے پہلے
وہ چل بسیں اور انہیں بتایا بھی نہیں گیا۔ گاؤں کا کوئی
دوست سب سے چھپ کر انہیں بتا گیا۔ وہ روتے
ہوئے گاؤں پہنچے تو جنازہ اٹھ چکا تھا۔ وہ گاڑی دوڑاتے
ہوئے قبرستان پہنچے تو دعا مانگی جا رہی تھی۔ انہوں نے
نم آنکھوں سے مٹی کو چھوتے ہوئے دعا میں شرکت
کی اور روتے ہوئے انتہائی صدمے کے عالم میں باپ
سے کہا۔
"بابا! آج کے دن بھی آپ نے مجھے نہیں بلایا؟
اب میں کبھی بھی اس گاؤں میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔
آج سے پہلے آپ نے مجھ سے تعلق توڑا تھا، مگر آج
میں ہر تعلق توڑ کر جا رہا ہوں۔"
اور وہ اپنے عہد کے ایسے پکے نکلے کہ پھر لوٹ کر
گاؤں نہیں گئے۔
ماں کے چہلم کے بعد انہیں اپنے حصے کی زمینوں
کی کاغذات ملے تو وہ حیران رہ گئے۔ یہ تو انہیں بعد میں
پتہ چلا کہ ان کے باپ نے ان کی ماں کو چھپ چھپ کے
ان سے کہا تھا کو "تو غلام مصطفیٰ سے ملنا چھوڑ دے میں
اسے جائیداد کا حصہ دے دوں گا۔"
اور وہ ایسی بھولی ماں کہ اس ایک بات کو لے کر بیٹھ
گئیں۔
اور جب چند سال بعد جب وہ بیمار ہو کر اسپتال میں
داخل ہوئے تو وہ انہیں دیکھنے جاتے اور روزانہ گھر سے
کھانا بنوا کر لے جاتے۔ وہ ان کے سر پر ہاتھ رکھے
دعائیں دیتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے مگر جب اسپتال
میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تو وہ وہیں سے چلے آئے۔
ویسے بھی ماں باپ کے بعد گاؤں میں اب ان کا رکھا ہی
کیا تھا۔ سوائے ایک بھائی کے جس کی وجہ سے وہ جلا
وطنی کاٹ رہے تھے۔
ان کی ساری خوشیاں اب مریم اور سیف کے لیے
وقف ہو گئی تھیں۔
بینک کی جاب ان کا شوق تھی پھر ضرورت بن گئی پھر
جب ان کا حصہ انہیں مل گیا تو پھر ضرورت نہ رہی تھی
لیکن وہ جاب کرتے رہے البتہ ان کا جاں نثار ملازم
خان محمد ہی جائیداد کے سارے معاملات وہ سنبھالتا۔
انہیں تو گھر بیٹھے رقم مل جاتی تھی۔ سیف کے بعد ان
کے آنگن میں کوئی اور پھول نہیں کھلا۔ سو ان کی
ساری توجہ کا مرکز سیف ہی ہوتا۔
وہ ہر بات سے واقف رہنے کی کوشش کرتے جب
وہ اپنے شوق سے میڈیکل میں آیا تو زیادہ مصروف ہو
گیا۔ اس کی شامیں اکثر باہر گزرتیں۔ جب وہ شکوہ
کرتے تو وہ ہنس کر کہتا۔
"بابا! دوستوں کے ساتھ اسٹڈی کرنے جاتا
ہوں۔"
مریم بگڑتیں "جوان لڑکا ہے چھوڑیں۔ کیوں اتنی
پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ اس دور میں تو اتنی پوچھ گچھ لوگ
لڑکیوں سے نہیں کرتے، آپ بیٹے کا ناک میں دم کر
دیتے ہیں۔"
اور وہ کہتے۔ "یہی تو عمر ہوتی ہے لڑکوں کے بننے اور
بگڑنے کی، جب لڑکوں کی ہر خواہش پوری ہو رہی ہو تو
وہ کچھ ایسی خواہشیں پال لیتے ہیں جو جان کا روگ بن
جاتی ہیں۔"
وہ اچانک چونک کر ماضی کی گلیوں سے باہر آ گئے
سیف نے کچھ کہا تھا۔ انہوں نے قریب ہو کر سننے کی
کوشش کی۔
"تم ۔۔۔ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔"
انہوں نے غور سے بیٹے کو دیکھا۔ جو کچھ وہ غنودگی میں
کہہ رہا تھا، وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ "کیا
سیف کسی کو پسند کرنے لگا تھا۔ مگر مجھے اس بات کا علم
کیوں نہ ہو سکا؟"

✿ ✿ ✿

وہ چند دنوں میں ہی صائمہ جبیں سے گھل مل گئی
تھی۔ حالانکہ دونوں کی طبیعتوں میں بہت فرق تھا۔ وہ
پارہ صفت اور یہ مستقل قرار، وہ طبعاً ہنس مکھ گھلنے
ملنے والی، یہ سنجیدہ مزاج مختصر بولنے والی۔ اس فرق کے
باوجود دونوں میں دوستی ہو گئی۔ صائمہ اکثر اسے
چھیڑتی۔
"سنا ہے نظامیوں میں وفا کم پائی جاتی ہے؟"
"غلط سنا ہے تم نے۔ آزما کر تو دیکھو۔" وہ فوراً
تردید کرتی۔
"یعنی آزمانے کے لیے مجھے کسی نظامی سے دل لگانا
پڑے گا؟" وہ صدمے سے دیدے پھاڑ کر شرارتاً
کہتی۔
"کسی اور سے نہیں مجھ سے۔" وہ ہنس کر اس کے
بیڈ پر آ بیٹھی۔
"تو کیا خاک مزہ آئے گا۔" وہ برا سا منہ بناتی تو عنیزہ
عارف بے ساختہ ہنستے ہوئے اسے تکیہ کھینچ مارتی۔
پھر اچانک صائمہ جبیں اپنی شامیں باہر گزارنے
لگی۔ شروع شروع میں تو اس نے توجہ نہ دی کہ وہ
گھومنے پھرنے، شاپنگ کرنے اور کھانے پینے کی
شوقین تھی۔ مگر جب وہ کالج سے آ کر شام کو مستقل
باہر جانے لگی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ چونکہ دوسروں کے
معاملات میں مداخلت کرنا اس کی عادت نہیں تھی اس
لیے کبھی اس نے صائمہ سے پوچھا نہیں تھا۔ اس نے
دیکھا تھا کہ صائمہ کی پڑھائی میں بھی پہلی سی دلچسپی باقی
نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اکثر کتاب کھولے سوچ میں گم
ہوتی۔
"یہ پڑھائی ہو رہی ہے؟" وہ ڈانٹ کر کہتی تو وہ جان
بوجھ کر ڈرنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اس طرح اچھلتی
کہ اس کے سامنے کھلی ہوئی کتاب زمین پر جا گرتی۔
اور وہ اس کی لاجواب ایکٹنگ پر ہنس پڑتی۔
"میں سوچ رہی تھی کہ اندر سے انسان کتنا
بدصورت ہے۔ نیلا، پیلا، لال، سبز رنگ، ریشے، پٹھے،
ہڈیاں، گوشت۔ اونہوں سوچوں تو متلی ہونے لگتی
ہے۔" وہ بڑی معصومیت سے منہ بنا کر کہتی تو عنیزہ
عارف ہنس پڑتی۔
"تم فنکار ہو تم، ویسے کہتی سچ ہو۔ اللہ سائیں نے

انسان کو کمال کی پوشاک پہنا کر خوب صورت بنا دیا ہے۔"

لیکن صائمہ کے بدلے ہوئے رویے سے اسے تشویش ہونے لگی تھی۔

اور تو اور اس کے معاملات میں وہ چنگیز خان کی ہمشیرہ میڈم حمیدہ بھی کچھ نہ بولتیں۔

"آج آئے تو ضرور پوچھوں گی" اس نے دل ہی دل میں تہیہ کیا۔ رات کے نو بج رہے تھے" اس نے ٹہلتے ہوئے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔

صائمہ ٹویوٹا سیلون سے اتر رہی تھی اور اس نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے کھڑکی سے سر نکالا، ہاتھ ہلایا اور گاڑی زن سے بھگالے گیا۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا کہ چوکیدار کیا کرتا ہے مگر وہ سر جھکا کر تالا کھول رہا تھا۔

وہ خاموشی سے آکر لیٹ گئی۔ چند منٹ بعد صائمہ گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

"کہاں سے آرہی ہو؟" اس نے گھور کر پوچھا۔

"حیدر آباد سے۔" اس نے بندے اتار کر ٹیبل پر رکھتے شرارتاً کہا۔

"اچھا یہ تو نئی خبر ہے۔" وہ جل گئی۔ "ہائے واوے ہم رہتے کہاں ہیں؟" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"حیدر آباد میں۔" اس نے ہنستے ہوئے بے پروائی سے جھمکے لٹکائے اور پیچھے سے واش روم میں گھس گئی۔ "توبہ ہے" عنیزہ عارف نے غصے سے ناک سکیڑی۔

وہ کپڑے تبدیل کر کے منہ دھو کر اس کے بیڈ پر آ بیٹھی۔

"ہاں محترمہ عنیزہ عارف [illegible] صاحب! غالباً آپ ناراض ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے [illegible] کھینچی۔

"جی نہیں تمہاری ایسی مجال کہاں۔" وہ [illegible] سے بولی تو اس کے جلے بھنے انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"محترمہ بندی حاضر ہے آپ کی خدمت میں۔ آپ تفتیش کر سکتی ہیں۔"

"صائمہ! اگر میں تم سے کوئی ذاتی سوال کروں تو؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ عنیزہ عارف کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا ہے تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو۔ تم میری بہت اچھی دوست ہو اور تمہیں یہ حق حاصل ہے۔" وہ دھیمے سے مسکرائی۔

"ٹھیک ہے تمہیں پتہ ہے تو تم خود ہی بتا دو۔" وہ رلی ہٹا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے سہیل اچھا لگنے لگا ہے۔ ہاں عنیزہ! میرا دل میرے قابو میں نہیں رہا۔" صائمہ نے دھیمے سے کہا۔ اس کے انداز میں پشیمانی تھی۔

"تو تم روز اس سے ملنے جاتی ہو؟" عنیزہ نے کہا تو جواباً وہ خاموش رہی۔

"صائمہ! ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہاں اس لیے نہیں بھیجا ہے کہ ہم پڑھنے کے بجائے ادھر ادھر کی رنگینیوں میں الو ہو جائیں۔"

"مگر [illegible] میری ماں نے مجھے کوئی ایسی نصیحت نہیں کی تھی کہ کسی سے دل نہ لگانا محبت نہ کرنا۔" وہ اپنی جگہ بے نیازی سے بولی۔

"مجھے پتہ ہے تم انتہائی ڈھیٹ ہو ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ہمشیرہ چنگیز خان (میڈم حمیدہ) نے کس خوشی میں تمہیں اتنی چھوٹ دے رکھی ہے؟"

"پیسہ۔" وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔ "پیسہ بہت بڑی چیز ہے میری جان! اسی سے آپ لوگوں کو خرید بھی سکتے ہیں ان کے منہ بھی بند کر سکتے ہیں۔"

"جی ہاں، ضمیر فروش لوگوں کو۔" اس نے جل کر کہا۔

"میں نے اس سے کہا تھا، جس وقت بھی کوئی گیٹ کھلا ہوا ملنا چاہیے۔ میرے معاملات میں تم اپنے کان اور زبان بند رکھو اور میرے گھر والوں سے میرے بارے میں کچھ نہ کہو تو میں تمہیں طے شدہ رقم سے دگنی رقم دے سکتی ہوں اور [illegible]

ہو گئی۔ تو اطمینان سے کروٹ لیتے ہوئے ستارے گننے لگی۔

○ ○

جس بات سے وہ صائمہ کو منع کرتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے وہ خود بھی اسی کا شکار ہو گئی۔ اس نے لاکھ بھاگنا چاہا مگر محبت کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ اس نے جانا کہ محبت اپنے انکار کو بچا کر رکھتی ہے۔ وہ اس سے بھاگے تو پیچھے بھاگتی ہے۔ نظر کو قید کر کے ہی چھوڑتی ہے۔

اس نے لاکھ خود کو سمجھایا اور شاید وہ خود کو سمجھانے میں کامیاب بھی ہو جاتی اگر سیف مصطفیٰ بھی اس کا پیچھا چھوڑ دیتا اور صائمہ اس کی پیچھو تو کتنا بند کر دیتی۔

"محبت کوئی جرم نہیں عنیزہ عارف! جو تم یوں مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی رہتی ہو۔ نکلو اپنے خول سے باہر۔ اور فخر سے دنیا کو فیس کرو کہ محبت تم میں ہوئی ہے۔"

صائمہ کی ان باتوں کے باوجود عنیزہ عارف اس دن کو بھی نہیں بھولی جب ہوسٹل کے باوجود وہ کالج گئی اور پھر سیف مصطفیٰ کی گاڑی میں صائمہ کے ساتھ بیٹھ کر ہوسٹل تک گئی۔ وہ اکیلی ہوتی تو مر جاتی مگر کبھی بھی سیف مصطفیٰ کی آفر قبول نہ کرتی مگر اس کے ساتھ صائمہ تھی۔ سیف، سہیل اور صائمہ اس سے ایک سال سینئر تھے مگر صائمہ کی روم میٹ اور دوست ہونے کی وجہ سے وہ اس کے گروپ میں ہی زیادہ نظر آتی۔ دوسری بات کہ سیف مصطفیٰ اور سہیل مزاری کی پکی یاری دوستی تھی اور پھر جب سہیل چند دن کے لیے گاؤں چلا جاتا تو صائمہ تک اس کی خیر خیریت سیف کے ذریعے ہی پہنچتی تھی۔ سہیل مزاری میں ہر وہ چیز تھی جو وڈیروں کی پہچان ہوتی ہے اس کے مقابل سیف مصطفیٰ دھیمے مزاج کا سادہ سا بندہ تھا۔ جس میں جنوبی سندھ کی سادگی جھلکتی تھی اور سہیل مزاری میں شمالی سندھ کی گرم جوشی نمایاں ہوتی تھی۔ وہ حد درجہ جوشیلا اور جذباتی تھا۔

اس کا اندازہ اسے دو تین ملاقاتوں میں ہی ہو گیا تھا۔

کچھ عرصے کے تجزیے کے بعد اس نے صائمہ سے اس بات کا اظہار بھی کیا تھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی کہ "یہ تو ٹھیک ہے نا۔ مردوں کو اپنے فیصلوں میں مضبوط اور جذباتی ہونا چاہیے۔ تمہارے سیف کی طرح نہیں کہ اچھو کی طرح صرف شکل دیکھتا رہے۔"

اس نے "تمہارے سیف" پر سٹپٹا کر اسے دیکھا اور وہ اس کی گھبراہٹ سے جی بھر کر محظوظ ہوئی۔

پھر جب اس نے سیف سے کالج کے علاوہ کہیں باہر ملنے سے انکار کیا تو صائمہ جھنجلا گئی۔

"تم بالکل بدھو ہو عنیزہ عارف! اتنی احتیاط! محبت تو کھا جاتی ہے۔ باہر ملنے میں کیا حرج ہے؟"

"ہم خود کو محبت سے تو نہیں روک سکے مگر غیر اخلاقی، غیر اسلامی اور معاشرتی روایتوں سے متصادم حرکتوں سے تو روک سکتے ہیں نا۔"

"تم بے کار کی ضد کر رہی ہو عنیزہ!" وہ کمزور لہجے میں بولی۔ "سیف نے میرے کان کھا لیے ہیں کہ میں تمہیں راضی کروں۔ بھلا اس میں برائی بھی کیا ہے۔ آخر میں بھی تو سہیل سے ملنے جاتی ہوں نا۔ بس چند گھنٹے کسی پارک میں یا ریسٹورنٹ یا سندھ کے کنارے بیٹھ کر مستقبل کی پلاننگ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کا حال سناتے ہیں اور واپسی میں وہ مجھے ڈراپ کر دیتا ہے۔"

"تم میری بات نہیں سمجھ سکتیں صائمہ!" اس نے بے بسی سے کہا۔

"اچھا تو پھر سمجھاؤ نا!" وہ بری طرح چڑ گئی۔

"دیکھو! کہیں ہمیں کسی نے دیکھ لیا۔ میرے بابا نے، بھائی نے یا کسی رشتے دار نے تو کیا جنگ چھڑ نہیں جائے گی؟ ہم جب اپنے پسماندہ علاقوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے نکلتے ہیں تو ہم پر بہت بھاری ذمہ داریاں پڑ جاتی ہیں۔" وہ رسانیت سے بولی۔

"تمہاری یہ نرالی منطق میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ ہم ان سے ایل ایم سی میں ملتے ہیں۔ لائبریری میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں تو پھر کسی شام کو کہیں باہر ان سے ملنے میں کیا مضائقہ ہے۔"

"کالج کی بات اور ہے۔ وہاں ہم پڑھنے کے لیے جاتے ہیں جہاں کسی سے ملنا یا بات کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ جب کہ کسی سے کام بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس سے باہر ملنا غلط بات ہے۔"

"تمہیں تو محبت کرنا ہی نہیں چاہیے تھی عنیزہ! اتنی ڈرپوک دقیانوسی ہو نا تم۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر اب دل مانتا ہی نہیں کوئی محبت۔" وہ افسردہ سی بولی۔ "تب ہی تو کہتی ہوں۔ محبت کے آگے ساری منطق، سارے دلائل بے کار ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑا انوکھا جذبہ ہے جو آپ سے اپنا آپ بھی چھین لیتا ہے۔"

اور عنیزہ عارف کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایک بوجھ سا دل پر آ گرا کہ کاش وہ بھی صائمہ جبیں کی طرح اپنے اس انوکھے جذبے کو پوری آزادی سے بھرپور طریقے سے محسوس کر سکتی۔ صرف محبت کی سرمستی میں مست ہو جاتی۔ مگر دل پر عقل غالب آ جاتی تو اسے لگتا جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ اپنی روایات سے بغاوت کی ہو اور اپنے ماں باپ، نرم خو والدین کو دھوکا دیا ہو وہ اپنی جگہ چور سی بن گئی تھی۔

دوسری طرف وہ ایک دن سیف مصطفیٰ کو نہ دیکھتی تو بولائی بولائی سی پھرتی۔ فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی اور پھر اس سے بات کر کے جب مطمئن ہو جاتی تو اپنی بے خودی پر خود ہی ہنس پڑتی۔ محبت واقعی دیوانگی ہے۔ اتنی محبت کے باوجود وہ سیف مصطفیٰ سے کہیں باہر ملنے کو تیار نہ ہو سکی۔

بالآخر اس کا حل بھی صائمہ جبیں نے ڈھونڈا اور بشیرو چنگیز خان کی آنکھوں پر پیسوں کی ایسی پٹی باندھی کہ چند دن کے وقفے سے شام کو سیف اس کے بجائے ڈرائنگ روم میں عنیزہ کو منتظر ملتا۔ وہ دونوں سیاست، ادب، عالمی مسائل پر گھنٹوں باتیں کرتے محبت محسوس کرنے کی چیز ہے۔ سو اک دوسرے کی سنگت ہی کافی تھی۔ خواہ گفتگو کسی موضوع پر ہو اور جب بھی وہ شاہ لطیف کی بات کرتے اک دوسرے کو بیت، شعر سناتے تو ان کے پور پور سے محبت چھلکنے لگتی۔

"شاہ کا سارا رسالو صرف محبت ہے۔" وہ کھنکتی تو سیف مسکرا کر اسے دیکھتا۔

"مجھے تو لگتا ہے تم بھی شاہ کی کوئی سورمی ہو۔"

"اچھا!" وہ بے ساختہ ہنس دیتی۔ "شاہ کی تو ساری سورمیاں ہیں میں کون سی والی ہوں؟"

"تم از کم سسئی نہیں جس نے تو کتنے پہاڑ پر اپنا محبوب دے دیا تھا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا۔

"مگر سیف! تم یہ بھی تو دیکھو پھر اس نے پنہل کو منانے کو کیا کیا جتن کیے۔ مجھے ہمیشہ اس کا رقص جنوں حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔" اس نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"جب بابا کے تھیڑے لیلاں اپنی جان محبوب کے قدموں میں نچھاور کر دیتی ہے۔ اور پھر محبوب بھی اس کی یہ محبت دیکھ کر اپنی جان ہار دیتا ہے۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ہاں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت زر و جواہر پر اپنا محبوب بھی دے سکتی ہے۔ زیورات اس کی کمزوری ہوتے ہیں نا۔" سیف اسے اداسی سے نکالنے کی خاطر چھیڑتا۔

"جی نہیں۔" وہ چڑ کر کہتی۔ "ماروی بھی تو شاہ کی سورمی ہے نا جس نے اپنی پھٹی پرانی پیوند زدہ چادر کو کمخواب، زر و جواہر پر فوقیت دی اور عمر کو صاف جواب دے دیا کہ میں تیرے محلوں کو اپنے جھونپڑے پر قربان کر دوں گی۔"

سیف کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ "تو تم لیلاں ہو یا ماروی؟" وہ شرارت سے کہتا۔

"ماروی!" وہ فخر سے کہتی۔

"تو کہیں مجھے چھوڑ نہ دینا۔" وہ جان بوجھ کر اسے چڑاتا۔

"جی نہیں۔ ماروی نے عمر اور اس کے محلات کو چھوڑا تھا اپنے منگیتر کو نہیں۔" وہ کہہ کر پچھتائی۔

سیف کے بلند قہقہوں پر وہ کھسیا گئی۔

"تو کیا خیال ہے انگوٹھی پہنانے کے بارے میں۔ لے آؤں؟"

... کرتا رہا۔
ہی نہیں اپنے لیے ... لیتے ہوئے
... نظروں پر ...
... بے اختیار ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

صحت یاب ہو کر گھر گیا تو خان محمد ہر وقت اس کے کمرے میں موجود رہتا۔ اس کے ساتھ باتیں کرتا۔ خان محمد کی محبت کی قدر تو پہلے ہی تھی اور اب اس کے دل میں اور بھی بڑھ گئی تھی۔

"بابا! اب میں ٹھیک ہوں۔ سوچ رہا ہوں کل سے پھر سے پڑھنا شروع کروں۔" وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں بیٹا! ابھی نہیں کچھ دن اور ریسٹ کرو۔ صحت ... کے بعد ہی پڑھنے کے لیے تو عمر پڑی ہے۔"

"لیکن بابا! اب میں ٹھیک ہوں بہت حرج ہو گیا ہے پڑھائی کا۔" اس نے بے دلی سے پرائی پلیٹ کھینچی۔

"کوئی حرج نہیں ہوگا۔ میں نے بات کر لی ہے تمہارے پروفیسر سے۔ ویسے بھی چند دن بعد تمہاری ماں اور ماموں عمرے سے آ رہے ہیں۔ چلو کراچی چلتے ہیں۔ وہاں تم ماموں کی فیملی کے ساتھ رہو گے تو تمہارا جی بہل جائے گا۔ گھر میں تو اکیلے ہی پڑے بور ہوتے رہتے ہو۔"

"نہیں بابا! آپ جائیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔ جس دن امی آئیں گی اسی دن یہاں سے ریسیو کرنے چلا جاؤں گا۔" اس کا دل اچانک کھانے سے اچاٹ ہو گیا۔

"ارے ارے کھانا تو کھاؤ۔"

"بس بابا! دل نہیں چاہ رہا۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ "میں تو تنہائی کو ترس رہا ہوں کہ اس کی یادوں سے جی بہلا سکوں اب تنہائی کیسے بری لگتی ہے۔" اس نے والٹ نکال کر اس کی تصویر کو دیکھا۔

"خان! اندر کیوں آئے ہو؟"

"سیف بابا! ابھی میں نے کہا کہ دیکھوں آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے اور تم ... کرتے ہے۔" وہ غصے سے چلایا تو خان محمد بھاگ کر باہر نکل گیا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

"تمہارے چھوڑنے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا عنیزہ!" وہ تھک کر بیڈ پر آ بیٹھا۔

"کہاں جاؤں میں کوئی ٹھکانہ پتا نہیں۔ تمہاری آنکھیں تم ہو ..." اس نے والٹ میں رکھی اس کی تصویر نکالی۔ وہ یک ٹک اس کے ہنستے ہوئے روپ کو دیکھتا رہا۔ آنسو ایک دوسرے کے تعاقب میں اس کی گود میں گم ہو رہے ہیں۔

دوسرے دن جب ... غلام مصطفیٰ باہر نکلے سیدھا ... ایم سی چلا گیا۔

"شاید اس نے فیصلہ بدل دیا ہو۔ پھر سے پڑھائی شروع کر دی ہو۔"

"فراز!" اس نے عنیزہ کے کلاس فیلو کو آواز دے کر ... کہا۔

"... تم آؤ کیا حال ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے اب تمہاری؟"

"ہاں اب میں ٹھیک ہوں۔"

"سیل کا کچھ پتا چلا؟"

"بھاڑ میں جائے وہ بزدل۔ ... نہیں کہاں جا کر چھپا ہے۔ تم یہ بتاؤ عنیزہ آئی تھی میری غیر موجودگی میں؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں سنا ہے اس نے پڑھائی ہی چھوڑ دی ہے۔"

"ہاں تم نے صحیح سنا ہے۔"

"کیا اس نے تم سے بھی رابطہ توڑ لیا؟"

اس نے مایوسی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر کیوں پوچھ رہے ہو اس کا چھوڑ دو اسے۔" وہ مسکرایا۔

اس نے حیرت سے فراز کو دیکھا۔ "اس کو چھوڑنا اتنا آسان نہیں فراز!"

"دیکھو! بہت سی اکثر قصوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اخیر بچے ہیں بڑی زور و شور قسم کی محبتیں شروع ہو گئی ہیں۔ ... یعنی محبتیں پڑھائی کے دوران ہو جاتی ہیں۔ پھر پریکٹیکل لائف میں جب آتے ہیں تب سب بھول جاتے ہیں۔"

"میری محبت موم تو ٹوٹنے والی نہیں ہے فراز! میری تو سانسوں میں بسی ہے۔ اگر میری محبت دم توڑ دے تو میری تو زندگی ہی ختم ہے۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "تم میرے ساتھ چل سکتے ہو شاید ہم اس کے گاؤں کو ڈھونڈ نکالیں۔"

"تو کیا تمہیں اس کے گاؤں کا بھی علم نہیں ہے؟ حیرت ہے سیف!"

"مجھے کیا پتا تھا کہ وہ راستے میں ہی ساتھ چھوڑ دے گی۔ بابا کو بتا کر اس کے گاؤں رشتہ مانگنے کے لیے بھیجتا تو پتہ بھی پوچھ لیتا لیکن اس کا موقع ہی نہیں آیا۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"بس اتنا پتہ ہے کہ کوئی ضلع بدین میں نظامانیوں کا گوٹھ ہے۔ جہاں رئیس عارف رہتے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں عنیزہ اور فیروز۔ ہم عنیزہ کا نام نہیں لے سکتے۔ رئیس عارف اور رئیس فیروز کا پتہ پوچھیں گے۔"

"تم نے رئیس عارف کو دیکھا ہے؟" فراز اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

"نہیں البتہ ایک بار عنیزہ نے مجھے کچھ تصویریں دکھائی تھیں جو شاید اس نے اپنی کسی کزن کی شادی میں کھینچی تھیں۔ جس میں رئیس عارف کا بھی ایک سائڈ پوز تھا۔ وہ کسی سے بات کر رہے تھے۔ وہ تصویر ایسی نہیں تھی کہ ایک نظر دیکھ کر ہی انہیں پہچان لوں۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے کہا۔

وہ امید و بیم کی کیفیت میں گھرا سارا دن اسے تلاشتا رہا۔ تین چار گوٹھوں میں رئیس عارف نامی لوگ ملے بھی تو یا تو وہ نوجوان نکلے یا ان کی سماجی و معاشی حیثیت بالکل ہی نہیں تھی۔ وہ عام مزارع تھے۔

رات ہوئی تو وہ واپس لوٹ آئے۔ سیف گھر پہنچا تو رات کے ... بج رہے تھے اور رئیس غلام مصطفیٰ پریشانی سے باہر ٹہل رہے تھے۔

"تم کہاں چلے گئے تھے سیف؟"

"بابا! دوستوں کے ساتھ تھا۔ ... تک گیا تھا گھومنے۔" اسے بروقت بہانا سوجھا۔ "میں اب تھک گیا ہوں سوؤں گا۔" وہ نظریں چرا کر جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

"کھانا کھایا ہے؟"

"جی میں نے کھا لیا تھا۔" وہ جلدی سے اندر گھسا کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں میں آنے والے آنسو نہ دیکھ لیں۔ جو دروازہ لاک کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ چھوڑنے کا دکھ اور بے مراد سفر نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بتایا تھا اسے سارے دن کی مسافت کے بعد کوئی اشارہ بھی نہیں ملا۔

"کہاں ڈھونڈوں میں تمہیں عنیزہ عارف!" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسائے۔

☼ ☼ ☼

"یہ پکڑو۔" صائمہ نے اسے دو پیکٹ تھمائے۔

"کیا ہے یہ؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کھول کر دیکھ لو تم۔" وہ مسکرائی۔ اس نے فوراً ریپر پھاڑا تو وہ اس کی عجلت پر ہنسنے لگی۔ آسمانی رنگ کا سوٹ میچنگ جیولری شوز پرفیوم اس نے ابھی بھی نظروں سے صائمہ کو دیکھا۔ جو چہرے پر کلینزنگ لوشن لگا کر ٹشو سے صاف کر رہی تھی۔

"سیف نے بھیجا ہے اور اس نے کہا کہ کل ——— جب وہ تم سے ملنے آئے گا تو تم انہی کپڑوں میں تیار ملو۔"

"تمہیں پتا ہے کہ آج تک میں نے اس سے کوئی گفٹ نہیں لیا تو تم یہ چیزیں کیوں اٹھا لائی ہو۔" وہ ناراض ہوئی۔

"تمہاری ساری منطقیں نرالی ہیں عنیزہ! محبت بھی کی جا رہی ہے ملاقات بھی کی جا رہی ہے۔ مگر باہر

نہیں ڈرائنگ روم میں، جس کی کھڑکیاں جان بوجھ کر کھلی رکھی جاتی ہیں۔" وہ سمجھ ہوئی تو اس نے افسردگی سے اسے دیکھا۔

"دل کا کاروبار جاری، مگر گفٹ لینے دینے سے انکاری۔ ہم شاپنگ کرنے گئے تو سیف بھی ساتھ ہو لیا اور کہا کہ کل عنیزہ کو میں اپنے پسند میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے تو غلطی ہوئی کہ اٹھا کر لے آئی۔ اب تم جانو اور سیف جانے۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔" اس نے کہتے ہوئے غصے میں کمبل اوڑھ لیا۔ اور عنیزہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ لہجے کی تلخیوں سے ڈرنے والی۔

دوسرے دن صائمہ صبح سے ہی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ زرد اور سرخ رنگ کے امتزاج والا سوٹ، جس پر موتیوں کے ساتھ نفیس کڑھائی کی ہوئی تھی۔ اس نے استری کر کے الماری میں رکھا۔

"تم آج یونیورسٹی نہیں جاؤ گی؟" اس نے ناشتہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"نہیں، کون جائے آج بور ہونے۔" وہ بے وجہ ہنسی۔

سچ کہا تھا صائمہ نے۔ وہ خود بھی آخر بور ہوئی تھی۔ سہیل، سیف، صائمہ، اس کے روپ سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے بے دلی سے بڑی مشکل سے وقت گزارا تھا پھر [illegible] کھانا کھایا اور سو گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو صائمہ تیار ہو رہی تھی۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ صائمہ کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔

"چلو اٹھو، تم بھی تیار ہو جاؤ۔ آخر کو تمہارا سیف بھی تم سے ملنے آئے گا۔ ویسے عنیزہ! تم ہو بہت ضدی۔ آج کے دن تو اس سے کہیں باہر مل لیتیں۔" اس نے جیولری پہن کر پرفیوم اسپرے کیا۔

وہ کسل مندی سے لیٹی اسے دیکھتی رہی۔ اس نے جھک کر سینڈل پہنا، لپ اسٹک اٹھا کر پرس میں ڈالی۔

"عنیزہ! جن سے ہم محبت کرتے ہیں ان پر اعتماد کرنا ہی پڑتا ہے، ورنہ پتا ہے کیا ہوتا ہے؟" اس نے شرارت سے اسے دیکھا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، وہ خم کر اس کے بیڈ کی طرف آئی۔ "محبت کمزور ہو جاتی ہے پگلی! اب اٹھو بھی، سیف بھی آنے ہی والا ہو گا۔" اس نے کمبل اس پر سے کھینچ کر اتارا۔

"ٹھہرو، ارے اٹھتی ہوں، سردی لگ رہی ہے۔" وہ چیخی۔

"ایک تو تمہاری سردی ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔" اس نے بڑبڑا کر کہا اور گفٹ اٹھا لیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی وہ آنکھیں موندے سستی سے لیٹی رہی۔

"عنیزہ باجی! آپ کا کوئی مہمان آیا ہے۔" ملازمہ جس کے ذمے ان سب کا کھانا اور پیغام رسانی تھا، اسے بلانے آئی تھی۔

"میں آ رہی ہوں پانچ منٹ میں۔" وہ کمبل پھینک کر جلدی سے واش روم میں گھس گئی۔ تولیے سے منہ پونچھتی وہ ڈریسنگ ٹیبل تک آئی۔ عجلت میں بال بنا کر سادہ سے کاٹن کے سوٹ کی شکنیں اپنے ہاتھوں سے درست کیں، اس کے بھیجے ہوئے گفٹ اٹھا کر نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

صوفے پر بیٹھا سیف اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تھینک یو۔" اس نے مسکرا کر پھول اور کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا، وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے لب بھینچے اس کے سادہ سے روپ کو خوشی اور ناراضی کی ملی جلی کیفیت سے دیکھتا رہا۔

"بیٹھو نا، تم کھڑے کیوں ہو۔"

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"تمہیں دکھ ہو رہا ہے نا سیف! کہ میں نے تمہارا بھیجا ہوا سوٹ نہیں پہنا۔" وہ کچھ بھی بولے بغیر لب بھینچے خاموشی سے اسے تکتا رہا۔

"میں یہ سوٹ پہنوں گی مگر جائز حیثیت میں۔ ابھی تم لے جاؤ۔ جب اماں کو لے کر آنا، تب یہ سوٹ بھی ان کے ہاتھ منگنی کی انگوٹھی کے ساتھ بھیجنا۔" اس نے کہتے ہوئے نظریں چرائیں۔

سیف کے بھینچے ہوئے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ مچل گئی۔

"کتنی خوب صورت بات کہی ہے تم نے۔" وہ کھل کر ہنسا۔ "مگر سچ پوچھو تو یہ گفٹ نہ لینا، تمہاری اپنی سوچ ہے۔ بالکل ہی دقیانوسی خیالات، جو اس دور میں نہیں چلتے۔"

"نہیں سیف! یہ بوگس خیالات نہیں۔ تم غور کر کے دیکھو تو کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے بس میں نہیں ہوتیں۔"

"مثلاً؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مثلاً محبت۔"

"اچھا اور۔۔۔؟"

"اور کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے بس میں ہوتی ہیں۔ تم سمجھو کہ یہ گفٹ نہ لینا ان ہی باتوں میں سے ہے۔"

"تو کیا میری خوشی مقدم نہیں ہے تمہارے لیے؟"

"تمہاری خوشی مقدم ہے تب ہی میں تم سے ملنے آئی ہوں ورنہ میں اتنی جلدی ملنے کی بھی قائل نہیں جب تک ہمارے درمیان کوئی سماجی رشتہ نہ قائم ہو جائے۔"

"محبت سماجی رشتہ نہیں ہے؟"

"نہیں یہ تو قلبی و روحانی رشتہ ہے جو بعض دفعہ سماجی رشتوں کے تصادم میں آ جاتا ہے۔" وہ چند لمحوں کے سکوت کے بعد گویا ہوئی۔

"محبت میرے لیے مادی چیز نہیں کہ اس کے بدلے میں کوئی مالی یا مادی فائدہ ڈھونڈوں گی۔ ہم میں اور ان عورتوں میں کچھ تو فرق رہنے دو جن کا مشغلہ ہی لڑکوں کی جیبیں خالی کرانا ہے۔ ایسی عورتیں محبت پر کم ہی قابض ہوتی ہیں۔" وہ افسردگی سے کہنے لگی۔

"اور محبت کن پر قابض ہوتی ہے؟"

"میرے جیسی عورتوں پر محبت قابض ہوتی ہے جن کے لیے اہمیت ہوتی ہے تو صرف محبت کی۔ کوئی بھی مالی، مادی فائدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا جن کے لیے۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"تمہاری یہ بات بھی پیاری ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔"

اس دن وہ کمرے میں آئی تو اس کے دامن میں بہت خوش کن وعدے بندھے ہوئے تھے اور بہت خوب صورت لمحے جو اس کے دل میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

ملازمہ آ کر اسے کھانا دے گئی۔ اس نے چند نوالے لے کر ٹرے واپس کر دی ویسے بھی جس دن وہ بہت زیادہ خوش ہوتی، اس دن کھانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ خوشی میں اس کی بھوک اڑ جاتی تھی۔

"اف دس بج گئے، ابھی تک صائمہ نہیں آئی۔" وہ آ کر بستر پر لیٹ گئی، ریموٹ اٹھا کر مختلف چینل بدلتے ان ہی سوچوں میں اسے نیند آ گئی۔

نہ جانے کون سا وقت تھا۔ جب دروازہ زور سے بند ہونے پر اس کی آنکھ کھلی۔

"صائمہ! تم آ گئیں؟" اس نے کمبل منہ سے ہٹائے بغیر پوچھا۔

"ہاں!" اسے لگا کہ اس کی آواز کانپ رہی ہے۔ "سردی میں آئی ہے شاید اس لیے۔" وہ پھر سو گئی۔

☼ ☼ ☼

"سیف کی کوئی خبر لیں۔ کل اس کا دوست کیا نام ہے بھئی، ہاں وہ فراز اس کا پوچھ رہا تھا کہ بہت دنوں سے پڑھنے نہیں آ رہا۔ وہ ٹھیک تو ہے؟ اب میں کیا کہتی اسے رئیس! کہ گھر سے تو روزانہ اسی بہانے نکلتا ہے۔"

رئیس غلام مصطفیٰ نے سگریٹ ایش ٹرے میں رگڑ کر بجھا دیا۔

"کہاں ملا تھا تمہیں؟" انہوں نے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر استفسار کیا۔

"کل سینٹر پر ملا تھا۔ ایک دو بار وہ پہلے گھر بھی آ چکا

ہے سیف اور سہیل کے ساتھ اسٹڈی کرنے۔" وہ بیڈ کی پائنتی بیٹھ کر بولیں۔

"ہاں۔ ڈاکٹر عبدالقادر نے بھی مجھ سے شکایت کی ہے کہ سیف بہت دنوں سے کالج سے غیر حاضر ہے اور یہ کہ وہ کسی الجھن کا شکار ہے اور ہمیں اس کی الجھن کا پتہ لگانا چاہیے۔ میرے سامنے تو کھلتا نہیں تمہیں ہو سکتا ہے تمہیں بتا دے۔ ذرا پوچھ کر تو دیکھو۔" وہ چائے کے ہلکے ہلکے گھونٹ لینے لگے۔

"اپنے تئیں تو میں نے بھی بہت پوچھا ہے مگر اس نے بتایا نہیں کہتا ہے اماں! سہیل والا واقعہ میرے دماغ پر چڑھ گیا ہے، بس میں چند دنوں میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تھوڑا سا وقت دیں مجھے پھر میرے ساتھ بیٹھتا ہے، باتیں کرتا ہے۔ وہ یہ سب مجھے دھوکا دینے کی خاطر کرتا ہے ورنہ میں ماں ہوں اس کی پریشانی مجھ سے کہاں چھپی رہ سکتی ہے۔"

"تم پھر بھی تم کوشش کرتی رہو کیا پتہ کسی کمزور لمحے میں نکل جائے۔" انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں سہیل کہاں چلا گیا ہے بیچاری لڑکی نگل لیا اسے۔ رحیم! دیکھو کہیں اس وجہ سے تو سیف پریشان نہیں کہ کہیں سہیل کا دوست ہونے کی وجہ سے وہ پولیس کی پکڑ میں نہ آ جائے۔" ان کا دل ایک بار پھر خدشوں سے بھر گیا۔

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ تم خوامخواہ کے وہم نہ پالو۔" انہوں نے بیوی کو تو مطمئن کر دیا مگر خود گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"سیف!" وہ ماں کی پکار پر کمرے میں جاتے جاتے رک گیا۔

"کھانا کھایا بیٹا؟"

"نہیں اماں!"

"اچھا تم چلو اپنے کمرے میں، میں تمہیں لے کر آتی ہوں۔"

وہ سر ہلا کر چلا گیا۔ "میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں تم کہاں جا چھپی ہو عنیزہ! میں تیسری بار تمہارے علاقے سے ناکام لوٹا ہوں۔ ہجر بھی کالے پانیوں کا سفر ہے جس میں گم ہوتا جا رہا ہوں، ڈوبتا جا رہا ہوں کوئی آس کا تنکا بھی نہیں جس کے سہارے نکل سکوں ابھر سکوں۔ یہ کیسی مسافت کی ڈور تم نے میرے پاؤں میں باندھی ہے کہ سفر ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا۔ کوئی منزل کا نشان نہیں کوئی مسافت کا اختتام نہیں۔ صرف گرد سفر ہے اور ہجر ہے جو جسم و جاں سے لپٹا۔ جدائی کا ساتھی بنا ہے۔" وہ آنکھوں میں آنے والی نمی کو بار بار صاف کر رہا تھا۔

"سیف بیٹا! اٹھو کھانا کھا لو۔" وہ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ ملازم ٹرے اٹھائے ان کے ساتھ تھا۔ وہ جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔

"سیف! اٹھو بیٹا!" وہ پلیٹ میں سالن نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں۔

وہ اٹھ کر واش روم میں منہ دھونے چلا گیا۔ واپس آ کر کرسی پر بیٹھا۔

"اماں! آپ نے کھا لیا؟" اس نے نوالہ توڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، ہم نے کھا لیا۔ اب تم کھاؤ تو میں جا کر سوؤں۔" وہ اس کے کھانا کھانے تک خاموشی سے بیٹھی رہیں۔ وہ کھانا کھا چکنے کے بعد ہاتھ دھو کر واپس آیا تو انہوں نے بات چھیڑی۔

"سیف!"

"جی اماں!"

"بڑے دنوں سے پریشان لگتے ہو بیٹا! میں ماں ہوں تمہاری، سب سمجھتی ہوں۔ مگر تم کچھ بات نہیں کرتے۔ بتاتے نہیں آخر کیا بات ہے، جو بھی دل میں ہے وہ بتا دو۔" وہ اس کی پیشانی چومتے افسردہ ہو گئیں۔

"اماں! آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے، مائیں تو ہوتی ہی وہمی ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

وہ چلی گئیں تو وہ سوچنے لگا۔

"بابا تو اس طرف جانا ہی پسند نہیں کرتے حتیٰ کہ بہنوں کی طرف بھی نہیں۔ وہ کیسے مان سکتے ہیں کہ انہی کی ذات کی ایک لڑکی نے ان کے بیٹے سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ وہ کیسے میری مدد کر سکتے ہیں۔ اگر میں انہیں بتاؤں تو وہ تو ناراض ہو جائیں گے کہ میں ایک ایسی لڑکی کے پیچھے پاگل ہو رہا ہوں جس نے اپنا کوئی اتا پتا بھی نہیں چھوڑا ہے۔ بس ایک بار میں اسے ڈھونڈ نکالوں پھر ہر طرح سے بابا کو راضی کر لوں گا۔" اس نے پُرعزم ہو کر سوچا۔ "مگر تم مجھے ملو تو عنیزہ!" اس نے بے بسی سے خود کلامی کی۔

"ایک بار پھر میڈم حمیدہ کی طرف جا کر دیکھوں۔ اب اتنے مہینے ہو گئے ہیں ہو سکتا ہے اب کی بار وہ بتا دے۔"

اور دوسرے ہی دن وہ میڈم حمیدہ کے آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔

"آپ مجھے عنیزہ کا پتا دیں۔ میں آپ کو منہ مانگی قیمت دے سکتا ہوں۔"

"دیکھو سیف صاحب! میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی ہے۔ ویسے بھی عنیزہ کا پتا میرے پاس صرف بدین ضلع لکھا ہوا ہے۔ پہلے ہی بڑی خواری ہوئی ہے میری۔ کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ اب کوئی آدھی قیمت پر بھی گھر لینے تیار نہیں ہوتا۔ اوپر سے پولیس کی پوچھ گچھ۔ بڑی مشکلوں سے جان چھوٹی ہے میری۔ اگر آپ مجھے زیادہ تنگ کریں گے تو مجبوراً مجھے پولیس کی مدد لینا پڑے گی اور آپ کے لیے یہ شہادت ہی کافی ہے کہ سہیل آپ کا گہرا دوست تھا اور حادثے کے ٹائم آپ ہی اسے لے کر آئے تھے۔" وہ بغیر سانس لیے بولتی چلی گئی۔

وہ ایک بار پھر بے مراد لوٹا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دیکھ رہی تھی کہ صائمہ کافی دنوں سے کچھ پریشان لگ رہی ہے مگر وہ اسے کچھ بتانے سے بھی گریزاں تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس سے پریشانی کا سبب پوچھے مگر کئی بار وہ پوچھتے پوچھتے رک جاتی جب وہ مناسب سمجھے گی تو خود ہی بتا دے گی۔ یہ سوچ کر وہ خاموش ہو جاتی مگر اب وہ اس کو کچھ زیادہ ہی نوٹ کرنے لگی تھی حالانکہ یہ بات بھی اس کی طبیعت کے خلاف تھی۔ صائمہ بہت کم کلاسیں اٹینڈ کرتی۔ وہ اس پر بگڑتی۔

"صائمہ! خدا کے لیے ہم یہاں پڑھنے آئے ہیں اور تمہاری اتنی چھٹیاں۔ بہت حرج ہو رہا ہے پڑھائی کا۔"

وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر آنکھیں موندے پڑی رہتی۔

"آخر تم کو ہو کیا گیا ہے؟" بالآخر اس نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔ "اب تم سہیل سے بھی کم ملنے لگی ہو کیا کوئی ناراضی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دے کر کروٹ بدل لی۔

"آج تم مجھے بتا ہی دو۔" وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گئی۔ "میں انتظار کرتی رہی کہ شاید تم خود ہی بتا دو مگر تم تو ایک لفظ بھی نہیں بولتی ہو۔"

وہ بیڈ پر بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ اسے صاف لگا کہ وہ اس کے اپنائیت بھرے انداز پر آنکھوں میں آئی نمی اپنے اندر اتارنے کی کوشش کر رہی ہے۔

"صائمہ!" اس نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ صائمہ نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

"تم جاؤ عنیزہ! ورنہ پوائنٹ نکل جائے گا۔"

اس وقت تو وہ خاموشی سے چلی گئی تھی مگر شام کو جب سیف اس سے ملنے آیا اور وہ خوشگوار کیفیت میں جانے کو مڑی تو اس نے اسے پکار کر کہا۔ "عنیزہ ملنے میں محتاط رہا کرو اور اتنی جلدی جلدی مت ملا کرو۔ غالباً تین دن پہلے ہی سیف آیا تھا۔"

وہ رک کر اس کی طرف مڑی۔ "یہ تم کہہ رہی ہو صائمہ!" وہ ہنس کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"ہاں!" اس نے گھٹنوں پر رکھی کتاب کو افسردہ سی مسکان کے ساتھ بند کیا۔

"تم تو کہتی ہو احتیاط محبت کو کھا جاتی ہے؟" اس نے حیرت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں کہتی تھی۔" اس نے گہری سانس لی۔ "لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ مرد دریافت کا رسیا ہے عنیزہ! اگر وہ عورت کو مکمل دریافت کر لے تو پھر ٹکتا نہیں اڑ جاتا ہے۔ اس لیے کچھ دروازے اس پر ہمیشہ بند رکھنے چاہئیں تاکہ کشش برقرار رہے، میری جان! اس کے سارے ہی بھید کھل جائیں تو پھر من اپنی حیثیت کھو دیتا ہے اور من بے حیثیت ہو جائے تو سکون گم ہو جاتا ہے۔ اسے تلاشتے تلاشتے ہم اپنا آپ کھو دیتے ہیں۔"

اس نے تھکی تھکی سانس لی، وہ چپکے سے اٹھی تو وہ پھر بول پڑی۔

"احتیاط!" اپنی ذات کے کواڑ بند کر لو عنیزہ! اس لیے کہ مرد جیسا پنچھی ایسی زمین پر نہیں اترتا، جہاں بھید نہ ہو، اسرار نہ ہو۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اس دن وہ سیف سے بھی پوچھ بیٹھی کہ سہیل نے آنا کیوں کم کر دیا ہے؟

"پتہ نہیں۔" وہ بھی لاعلم تھا۔

"تو آخر بات کیا ہے؟" وہ کتنے ہی دن پریشان رہی۔ صائمہ کا وہی طرز عمل، کبھی موڈ ہوتا تو اس کے ساتھ چلتی ورنہ پڑی رہتی منہ لپیٹے ایک ہی کمرے میں بند۔ اب تو بہت دنوں سے اس کی طبیعت بھی گری گری رہنے لگی تھی، وہ میڈیکل کی طالبہ تھی جو بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی، وہ سمجھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ نہ ہی ایسی بات سوچنا چاہتی تھی مگر اب اس کی پریشانی حد سے سوا تھی۔

بہت دنوں بعد اس نے دیکھا کہ وہ سہیل سے ملنے گئی تھی۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگی۔ اس دن خلاف معمول وہ بہت لیٹ آئی۔ آتے ہی بغیر چینج کیے بستر میں جا گھسی۔ یہ واضح اشارہ تھا نہ کچھ سننے نہ کچھ بولنے کا۔ چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے کچھ نہ پوچھ سکی اور خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔

آدھی رات کا وقت ہو گا، جب اس کی آنکھ سسکیوں کی آواز پر کھلی۔ وہ سانس روکے اس کے رونے کو سنتی رہی پھر اٹھ کر اس کے پاس آئی۔

"صائمہ!" اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

"عنیزہ! عنیزہ! وہ کہتا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔" اس نے سسکتے ہوئے اس کی گود میں سر رکھا۔ "تمہیں کیا پتہ عنیزہ! میں پل پل جیتی اور مر رہی ہوں۔ وہ اب کہتا ہے کہ میں مجبور ہوں، جب، جب اک وجود میرے اندر پل رہا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ چلو میں تمہیں کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔"

وہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔ اسے لگا اس کے دل کی دھڑکن تھم چکی ہے اس کا چہرہ فق ہو چکا تھا اگر صائمہ اس کی یہ حالت دیکھ لیتی تو یقیناً رونا بند کر دیتی مگر اندھیرے میں ہی وہ اس کی گود میں سر رکھے بولتی چلی جا رہی تھی۔

"کیوں برباد کیا اس نے مجھے۔ وہ خود مہینوں میرے پیچھے چلا تھا۔ تب جا کر میرا دل کچھ مائل ہوا تھا۔ اس نے میرے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ اب وہ مجھے پھانسی پر لٹکا کر خود بری ہونا چاہتا ہے۔"

اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب اس کی سسکیاں صائمہ کی سسکیوں سے مل گئیں۔

کتنے ہی کٹھن دن اور بے رحم راتیں گزر گئیں۔ جب وہ ایک دوسرے سے آنکھیں چرائی رہیں۔ تب اک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

"اب تم کیا کرو گی صائمہ؟"

وہ کچھ دیر خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی "تم سیف کو کہو شاید وہ اسے راضی کر لے تمہیں پتہ ہے نا عنیزہ! اب میں اپنے والدین کے پاس نہیں جا سکتی۔ اس لیے کہ اب میں ان کے لیے باعث شرم بن چکی ہوں۔ وہ مجھے اس حالت میں قبول بھی نہیں کریں گے۔ وہ، وہ صرف مجھ سے نکاح کر لے پھر چاہے تو چھوڑ دے مجھے۔ تم سیف سے کہو وہ اس سے بات کر کے دیکھے۔"

اس نے بڑی دقت سے سیف کو یہ بات بتائی۔

"عنیزہ! وہ نہیں مانا۔ کہتا ہے میرے خاندان میں غیر خاندان سے عورت نہیں آتی۔ وہ دو بچوں کا باپ ہے اگر وہ صائمہ سے شادی کرے گا تو اسے جائیداد سے عاق کر دیا جائے گا۔"

"تو کیا تم سب کچھ جانتے تھے سیف؟" اس نے صدمے سے کہا۔

"نہیں، پہلے مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ میں کبھی اس کے گاؤں نہیں گیا اور گھر کی باتیں پٹھان کا رواج نہیں۔"

"تو پھر تمہیں کیسے پتہ چلا؟" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا۔

"اس نے مجھے خود سارے حالات بتائے ہیں اب، پھر بھی میں تمہارے کہنے پر اسے سمجھاؤں گا بلکہ یہیں لے آؤں گا۔ تاکہ صائمہ اور وہ بیٹھ کر اس مسئلے کا حل نکالیں۔"

اس دن کے بعد صائمہ اس سے روز پوچھتی کہ کب سیف اسے لا رہا ہے۔ ابھی تک سیف نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ صائمہ تو پڑھائی چھوڑ چکی تھی۔ اس کی پڑھائی بھی بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اب کبھی کبھار ہی جاتی، دونوں سر جوڑے آنے والے حالات سے نمٹنے کی حکمت عملی طے کرتی رہتیں۔

"اس سمسٹر کے بعد تم کہاں جاؤ گی؟" وہ پریشان ہو اٹھتی۔

وہ تلخی سے مسکرا کر کہتی۔ "جہاں اللہ لے جائے گا۔" وہ اس کی مبہم بات سمجھ ہی نہ پاتی۔

پھر اک شام سیف سہیل کو گھیر کر لے ہی آیا۔ وہ چاروں اک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔

"میں مجبور ہوں۔" سہیل نے جھجکتے ہوئے شروعات کی۔

"مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا سہیل مزاری!" صائمہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"ہم کسی ڈاکٹر کے پاس چلیں تو بہتر ہے بجائے یہاں فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کے۔"

صائمہ نے اپنے وجود کو ذلت کی گہرائیوں میں گرتے ہوئے محسوس کیا۔

"خرچا سارا میں اٹھاؤں گا۔ اس کی تم لوگ فکر نہ کرنا۔"

عنیزہ نے نفرت سے اسے دیکھا۔ "آخر صرف نکاح کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"نہیں عنیزہ! میری برادری کا مسئلہ ہے، چھ سال پہلے میں اپنی برادری کے سردار کی لڑکی سے شادی کر چکا ہوں اگر میرے خاندان والوں کو میرے نکاح کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ مجھے برادری سے، جائیداد سے عاق کر دیں گے۔ وہ لوگ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی کہ تم شادی شدہ ہو۔ کیوں پڑے تھے تم میرے پیچھے؟" وہ چلائی۔

"مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی صائمہ!"

"نہیں۔ تم نے مجھے صرف شکار کیا ہے۔" وہ رونے لگی۔

"میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں۔ تم چلو میں تمہیں اسپتال لے چلوں۔"

"جھوٹ مت بولو تم۔ مت دو ہوس کو محبت کا نام۔" وہ اس پر جھپٹی۔

"چھوڑو میرا گریبان!" سہیل نے اسے دھکا دیا۔ وہ سنبھل کر پھر اس پر جھپٹی "میں تمہیں چھوڑوں گی۔ یہ کیسے سمجھ لیا تم نے ابھی صرف عورت کی محبت دیکھی ہے انتقام کب دیکھا ہے تم نے۔ یہ" اس نے اپنے پیٹ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "یہ تمہارے خلاف سب سے بڑی شہادت ہے کہ تم نے جبر کیا ہے۔ میں تمہیں پھانسی کے پھندے پر لٹکواؤں گی۔" اس پر جنون سوار ہو چکا تھا۔

عنیزہ منہ پر ہاتھ رکھے بے آواز روتے ہوئے دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے صائمہ کا وحشت زدہ روپ دیکھتی اور بے تحاشا روتی جاتی۔

"کیا کر رہے ہو تم لوگ؟ ارے پاگل تو نہیں ہو گئے۔" سیف ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ان کی چیخوں پر میڈم حمیدہ کمرے میں چلی آئی تھی۔

سہیل بار بار خود کو چھڑاتا اور اس کو دھکا دے کر

بھاگنے کی کوشش کرتا وہ لڑکھڑا کر سنبھلی اور دوڑ کر اس کو پکڑ لیا۔

"مجھے زندہ گاڑ کر اب کہاں بھاگ رہے ہو۔" عنیزہ دونوں کو حیرت سے بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ جواب چھڑانے پکڑنے کی کوشش میں اک دوسرے کو مار رہے تھے۔

سہیل بھاگ کر باہر گاڑی تک آیا۔ صائمہ جنونی انداز میں اس کے پیچھے بھاگی۔

"تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" وہ گاڑی کے سامنے آگئی۔ عنیزہ اس کے پیچھے بھاگی' باہر ہاسٹل کی لڑکیاں حیرت و استعجاب سے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اک دو نے اس سے پوچھنے کی بھی کوشش کی تھی مگر وہ تیزی سے باہر نکلی۔ گاڑی آگے بڑھی تھی اور اس کے پہیوں کے نیچے کچلا ہوا وجود خون میں لت پت پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس سے پہلے سیف پہنچا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ سیف نے چوکیدار کی مدد سے اٹھا کر اسے اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ عنیزہ سیٹ پر لیٹے دونوں ہاتھوں سے سنبھالے چیخ رہی تھی۔

"سیف! جلدی کرو۔"

صائمہ کی سانسیں اکھڑتی جا رہی تھیں۔ پھٹی پھٹی آنکھیں ایک ہی جگہ منجمد ہو چکی تھیں اور اس سے عنیزہ عارف نے اپنا سارا اعتبار' اعتماد ان آنکھوں میں ہی کہیں کھو دیا۔

"رک جاؤ سیف!" وہ چلا کر رونے لگی۔ "اب کسی ہاسپٹل جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" آہستہ آہستہ گاڑی واپس آکر ہاسٹل کے دروازے پر رکی۔ محبت اس کی جان لے بیٹھی۔ کھا گئی اس کے ہنستے مسکراتے وجود کو۔

لان کے بیچ اس کا بے جان وجود رکھا تھا۔ لڑکیاں بدحال عنیزہ سے حالات جاننے کی کوشش میں لگی تھیں۔ کچھ اس کا دکھ بٹا رہی تھیں۔ تو کچھ بہلا رہی تھیں۔ "ایسیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔" وہ اور زور زور سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ ہی دیر میں پولیس لاش اٹھوا کر لے گئی۔

"یہ خودکشی کا کیس ہے' لڑکی خود آئی تھی گاڑی کے سامنے۔" کارروائی وہیں عمل ہو چکی تھی۔

اس کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ وہ ساری رات اپنے کمرے میں تڑپتی رہی خود کو کوستی رہی۔ صبح سہیل کو بلوایا۔ وہ اس کے بیڈ پر بیٹھی۔ اس کی ڈائریاں کو اٹھاتی جن میں لکھا ہوا ہر لفظ سہیل کی محبت میں گندھا ہوا تھا۔ روتے روتے اس کا گلا بیٹھ گیا تھا' ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ اک سناٹے کا عالم طاری تھا۔

صبح اس نے اپنے گاؤں کے قریبی شہر اپنے رشتے دار کو فون کر کے کہا کہ پاپا یا بھائی آ کر اسے لے جائیں۔ فون کر کے وہ بیٹھی ہی تھی کہ صائمہ کے بھائی آ گئے۔ اس سے حالات جاننے کے خواہاں۔ ان کے چہرے غصے سے تنے ہوئے۔ آنکھیں لال اور بپھرے ہوئے تھے۔ وہ ان کو دیکھ کر بے ساختہ رونے لگی۔

صائمہ اکثر رو کر کہتی تھی۔

"عنیزہ! تمہیں کیا پتا کہ میں نے اپنے بھائیوں کا مان توڑ دیا۔"

اور پھر اس نے کچھ نہیں چھپایا' جو جانتی تھی وہ انہیں بتا دیا۔ اسے سہیل سے کوئی ہمدردی نہیں تھی' نفرت کا شدید احساس تھا اور کچھ نہیں اس نے چند خطوط اور اک ڈائری کے علاوہ سب کچھ ان کے حوالے کر دیا۔ "یہ ڈائریاں آپ کو ساری کہانی بتا دیں گی۔"

"پولیس کا منہ تو پیسوں سے بند کر کے تفتیش سے روک دیا' پتا نہیں اب میڈم عمیمہ ان سے کیسے نبٹے گی۔"

اس نے سوچا' ان کے جانے کے بعد اس نے پیکنگ کی اور سیف کا انتظار کرنے لگی۔ اسے یقین تھا رات تک اسے بھائی لینے آجائے گا۔ اب یہاں اک پل بھی رہنا اس کے لیے محال ہو رہا تھا۔

اور جب سیف مصطفیٰ اس سے ملنے آیا تو وہ دروازہ کھول کر اس کے سامنے آ بیٹھی۔ اس کا خوف اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔

اسے لگ رہا تھا' عنیزہ عارف اس سے خوف زدہ ہے۔ کیا وہ مجھے بھی دنیا کے ان مردوں کے ساتھ کھڑا کرے گی جو پرندوں کو نہیں تتلیوں کو شکار کرتے ہیں۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا جب اس نے کہا۔

"تم بھی مردوں کے معاشرے کے ایک مرد ہو۔ تمہارے اور میرے راستے الگ ہو چکے ہیں۔"

وہ کہہ کر رکی نہیں تھی' مبادا سیف کی محبت اسے روک نہ لے۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے روک سکتی تو شاید ہار جاتی۔ سو اس نے اس کی کوئی بات نہیں سنی اور رات ہونے سے پہلے وہ ہاسٹل چھوڑ کر گاؤں کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک سال گزر گیا۔ سیف کی توجہ دن بدن پڑھائی سے ہٹتی چلی گئی۔ وہ سارا سارا دن کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں کئی بار رئیس غلام مصطفیٰ اس کے کمرے کی تلاشی لے چکے تھے۔ مگر کوئی بھی ایسی چیز انہیں نہیں ملی تھی جس سے وہ کسی نتیجے پر پہنچتے۔ سوچتے ہوئے سیف کے کمرے میں آ گئے۔

"آج اس سے سب کچھ اگلواؤں گا' پیار' غصہ سب آزماؤں گا' اس پر شاید وہ کچھ بتا دے۔"

وہ کمرے میں نہیں تھا' واش روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے بیڈ پر والٹ پڑا تھا۔ انہوں نے یوں ہی بے ارادہ اٹھا کر کھولا تو اس ہنستی ہوئی لڑکی کی تصویر پر نظر پڑی' وہ حیرت سے دیکھنے لگے۔

"یہ تو وہی ہے' بالکل ہو بہو اپنی ماں کا عکس۔" ایک نظر میں اسے پہچان گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

عجیب بات تھی۔ وہ اچانک اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ حالانکہ وہ بچپن سے ان کے گھر میں رہتی آئی تھی۔ لالہ اس کی زیادہ بنتی بھی نہیں تھی اس کے ساتھ کہ اب نوجوانی کی دہلیز پر وہ اسے اچھی لگنے لگی تو اس نے پہلے یہ بات ماں کو بتا دی۔ مگر وہ اس کی طرف مائل نہیں تھی۔ اس کی لائی ہوئی چوڑیاں جب ٹوٹی ہوئی ملیں۔ تو اس کو پتا چلا۔ اس کو دکھ تو ہوا تھا۔

پھر اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اور ادا عارف ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ پہلے پہل تو اسے غصہ آیا مگر پھر اس نے خود کو سمجھا لیا۔

اک دن جب وہ کالج سے آیا تو سنا کہ ادا اس کی منگنی عائشہ سے طے کر چکا ہے۔ وہ حیران رہ گیا لیکن ابا سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔ منگنی کے بعد ان کی آپس کی بول چال رسم و رواج کے مطابق بند تھی مگر اب اس کا بھائی بھی اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ دونوں بھائیوں کے بیچ عجیب تناؤ سا آ گیا تھا۔

عین اس کے امتحان کے دنوں میں عارف جیپ لے کر شکار پر چلا گیا۔ اسے بے تحاشا غصہ آیا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن آیا اور پھر جب شہر پہنچ کر کالج تک آیا تو پرچہ شروع ہو چکا تھا۔ اس کے کلاس پہنچنے کی کوشش کے باوجود اسے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا تھا۔ پھر وہ امتحان ختم ہونے تک شہر میں ہی رہا۔ البتہ اسلامیات کے آسان پرچے میں اس کی سپلی لگ چکی تھی۔

کچھ ہی عرصے بعد اس نے باپ سے کہہ دیا کہ وہ نوکری کرنا چاہتا ہے۔

"یہ زمینیں کون سنبھالے گا؟" اس کا باپ نے حیرت سے کہا۔

"مجھ سے نہیں ہوتی یہ دوڑ دوڑی۔ ادا عارف دیکھ لے گا زمینوں کو۔"

"رئیس! اگر نوکری کرنا چاہتا ہے تو کرنے دے' چار دن کا شوق ہے' جی حضوری کرنا پڑے گی تو خود ہی چھوڑ کر بھاگ آئے گا۔"

اس کی ماں کے کہنے پر اس کے باپ نے اپنے کسی دوست سے کہلوا کر اسے بینک میں ملازمت دلوا دی۔ وہ اس جاب کے سلسلے میں گاؤں سے باہر رہنے لگا تھا' جب اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں تو اسے گاؤں بلوا لیا گیا۔

"ساری عمر لوگوں کو دینے میں گزری ہے۔ اب

لینے کی باری آئی ہے۔" اس کا باپ خوش ہو رہا تھا۔
سردی کی راتیں گاؤں میں تو زیادہ ہی لمبی ہو جاتی ہیں۔ اس نے ٹارچ اٹھا کر گھڑی میں ٹائم دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ باہر چاندنی تھی سو اس نے ٹارچ نہیں لی۔ وہ باتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ کسی کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی وہ دبے پاؤں آواز کی سمت بڑھا۔
"تم مجھے زہر لا دو، میں کھا کر مر جاؤں پر اس سے شادی نہیں کروں گی۔ میرا دل اسے قبول نہیں کرتا۔"
"نہیں عائشہ! زہر کھائیں گے تو دونوں کھائیں گے پر میرے پاس ایک اور راستہ بھی ہے۔ ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں۔ میرے پاس اتنا پیسہ ہے کہ ہمیں کہیں بھی چل کر رہنے میں تکلیف نہیں ہوگی۔"
"پر عارف اگر ہم پکڑے گئے تو نہ ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے۔ اس سے بہتر ہے تم زہر ہی لا دو۔"
"نہیں عائشہ! ہم جیپ میں جائیں گے۔ تمہیں پتا ہے کہ پورے گاؤں میں ایک ہمارے پاس سواری ہے۔ یہ لوگ جب تک گھوڑوں پر شہر پہنچیں گے، وہاں سے کوئی گاڑی لے لیں گے، تب ہم ان کی پہنچ سے دور چلے جائیں گے۔ میرے چند دوست ہیں جو ہمیں مدد دے سکتے ہیں۔ تو پریشان نہ ہو۔ ہم ایک دوسرے کے بنا جی ہی نہیں سکتے۔"
آگے سننے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ یہ کیا ہونے جا رہا تھا۔ ان کے دونوں فیصلے خاندان کے لیے باعث ذلت ہوتے۔ ساری رات اسے نیند نہیں آئی۔
دوسرے دن اس نے شہر جانے کے بہانے عارف سے جیپ کی چابی لے لی تھی۔ شام کو جب وہ آیا تو عارف نے اس سے چابی مانگی۔
"بھیا! تم اس وقت کہیں جا رہے ہو؟" اس نے ترش لہجے میں پوچھا۔
"نہیں، صبح سویرے مجھے کھاد لینے جانا ہے، تم دیر سے اٹھتے ہو اس لیے ابھی دے دو۔"
"مجھے قریبی گاؤں میں کچھ کام ہے، میں رات کو وہاں جاؤں گا۔ دیر سے آؤں گا، تم صبح جب جاؤ تو مجھے اٹھا کر چابی لے لینا۔"
وہ بہانا بنا کر جیپ لے آیا۔ گاؤں کے باہر اس نے جیپ کھڑی کر دی اور خود اس مسئلے کا حل سوچنے لگا۔
"اگر میں ابا کو بتا دوں تو بھی انہیں صرف بھاگنے سے روک سکتا ہوں، خودکشی سے تو نہیں۔ کیسی ذلت ہوگی جب دو لاشیں اکٹھی اٹھیں گی۔ لاکھ بھائی برا سہی پر اس کی موت تو مجھے قبول نہیں اور عائشہ وہ کیوں بے گناہ مرے اور کیسی ذلت ہوگی جب وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" وہ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا۔
بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ کر آدھی رات کو گھر لوٹ آیا۔ عارف جاگ رہا تھا۔
"میں نے سوچا کہ صبح تمہاری نیند خراب کروں گا، اس لیے تم سے چابیاں لینے کے لیے جاگ رہا ہوں۔" عارف جھینپی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔
اس نے چابی جیب سے نکال کر اس کو تھمائی۔
"ادا! جو دو راہیں تم نے سوچی ہیں، ان پر بھی ذلت ہے اور جو راستہ میں نے نکالا ہے اس پر بھی ذلت ہے۔ جب تینوں راستوں پر ذلت کھڑی ہو تو عقل مندی کا تقاضا ہے کہ اس راستے پر چلا جائے جس پر ذلت کم سے کم ہو۔ جب اس گاؤں میں کل کا سورج ابھرے تو اس کی کرنیں تمہارے اوپر اس گاؤں میں ہی پڑنی چاہئیں۔"
عارف خوف زدہ ہو کر اسے دیکھتا رہا، کوئی جواب نہ دے سکا۔
وہ ساری رات اپنے بستر پر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا تھا۔ کمرے کے دوسرے کونے پر رکھی چارپائی پر عارف سونے کی ناکام اداکاری کر رہا تھا۔ اس کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں اس کے ماں باپ کی چارپائیاں پڑی تھیں۔ ان کے کمرے کے ساتھ جو کمرہ تھا اس میں ناہید اور عائشہ سو رہی تھیں۔
وہ بار بار ٹارچ جلاتا اور گھڑی دیکھتا۔ بجلی جیسی نعمت ابھی اس کے گاؤں کو نہیں ملی تھی۔
مرغوں نے اذانیں دینی شروع کر دی تھیں وہ پھر بھی جاگتا رہا۔ اس کے باپ کی کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ تہجد کے لیے اٹھ چکا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب اماں اٹھے گی اور اٹھ کر گرم پانی سے ابا کو وضو کروائے گی۔ وہ اب سو سکتا تھا، سو بے سدھ پڑ کر سو گیا۔
دوسرے دن اس کے شادی سے انکار پر ایک کہرام مچ گیا تھا۔
"اس کو حیا شرم نہیں، جب تاریخ طے ہو گئی ہے تب کہتا ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ جب منگنی ہوئی تھی تب انکار کرتا۔ میری یتیم بھتیجی میں اس کے پلے باندھتا ہی کیوں۔ اب لوگ تھو تھو کریں گے مجھ پر۔ میری پگڑی پاؤں میں ڈالنے کی بات کرتا ہے۔ تم سن لو غلام مصطفیٰ! تمہاری شادی ہوگی تو عائشہ سے ہوگی۔" اس کا باپ گرجا۔
باپ کی اسی ضدی طبیعت کی وجہ سے تو اس نے حقیقت نہیں بتائی تھی۔ وہ ہر صورت اس کی شادی عائشہ سے کروائے گا۔ اس نے سوچتے ہوئے باپ کو کہا۔
"میں شہری لڑکی سے شادی کروں گا۔ آپ عائشہ کی شادی ادا عارف سے کر دیں۔" اس نے سر اٹھا کر کہا۔
"بس زیادہ فیصلے نہ کر، میں نے کہہ دیا کہ تمہاری شادی طے ہے اور ہو کر رہے گی۔"
"میں بھی آپ کا بیٹا ہوں ابا! جب طے کر چکا ہوں کہ میں عائشہ سے شادی نہیں کروں گا تو پھر کسی قیمت پر آپ کا فیصلہ نہیں مانوں گا۔"
"سن لے اپنے بیٹے کی بات، میرا فیصلہ نہیں تھا، اس نے ہی بتایا تھا کہ یہ کہتا ہے عائشہ سے شادی کرے گا۔"
"مجھے کیا پتہ رئیس! اس نے خود ہی تو مجھ سے کہا تھا۔" وہ شوہر کے آگے کانپ رہی تھی۔
"وہ چند سال پہلے کی بات تھی۔"
"کیا! ابا کہتا ہے نامراد 'چند سال پہلے کی بات تھی۔' بول، یہ شادی بیاہ کوئی مذاق ہے۔" وہ چیخا۔
"میں یہ شادی کسی صورت نہیں کروں گا۔"
"میں تمہیں گھر سے نکال دوں گا غلام مصطفیٰ!"
"مجھے یہ فیصلہ منظور ہے۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"سچ کہا کچل سائیں نے
تک ہوندے لی جوئے چھڑن کیں نہ جوان
او بے بھی انسان جیہڑے ننگ ناموس تاں نثار تھیا"

(ایک زن دوسری زمین، چھوڑتے نہیں جوان بہادر لوگ، وہ بھی انسان جو ننگ و ناموس پر نثار ہو جاتے ہیں۔)
اس کے باپ نے دکھ سے مثال دی۔
اس کا جی چاہا کہ وہ سب کچھ اسی وقت باپ کو بتا دے کہ وہ عزت رہی تو سب کچھ قربان کرنے جا رہا ہے مگر عارف کی التجائیہ نگاہیں اسے کچھ بھی بتانے سے روک رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ گاؤں چھوڑ دے گا تو عائشہ کی شادی عارف سے ہی ہوگی اور ایسا ہی ہوا۔
اور اب اتنے سالوں بعد وہ کیسے جا کر اسی بھائی کے آگے دست سوال دراز کرتا۔
"تم اس لڑکی کے لیے پریشان تھے نا۔" سیف باہر نکلا تو اس نے پوچھا۔ سیف نے نظریں جھکا لیں۔ "میں اسے جانتا ہوں۔"
اس نے سر اٹھا کر حیرت سے باپ کو دیکھا۔
"یہ رئیس عارف کی بیٹی ہے نا؟" اس نے تصویر والا ہاتھ ہلا کر کہا۔
"جی بابا! آپ کو پتا ہے اس کے گاؤں کا؟" اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔
اس نے بیٹے کو دیکھا، اس کی آنکھوں کی نمی کو دیکھا، اس کا دل شفقت سے بھر گیا۔
"ہاں، یہ تیرے چاچا کی بیٹی ہے۔"

✿ ✿ ✿

"دیکھو ایک سال ہونے کو آیا، یہ سنبھلی نہیں۔

یہ واقعہ اس کے ذہن و دل پر چھا گیا ایسا کہ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا، بڑا علاج کروالیا ادی پر اس کو افاقہ نہیں ہوا۔ کہیں آتی جاتی بھی نہیں۔ پڑھائی بیچ میں چھوڑ دی۔ بات کریں تو جواب دیتی ہے ورنہ خود سے بات بھی نہیں کرے گی۔ دیکھو کیسے چہکتی تھی میری بیٹی! اس کو چپ لگ گئی ہے اسے۔"

وہ آبدیدہ ہو کر اپنی رشتے دار عورتوں کو بتا رہی تھیں۔

"ہائے مائی عائشہ! جوان جہان لڑکی ہے، بیمار کر گئی۔ لوگوں کی آنکھ چڑھ گئی ہوگی۔ کوئی دم دعا کرواؤ۔"

"ہائے ادی! دعائیں بھی بڑی کروائیں۔ پر یہ تو سارا دن اپنے کمرے میں ہی پڑی رہتی ہے۔ ہاں کتابیں رٹتی ہے بھائی کو نام لکھ کر روئے گی کہ وہ لے آؤ۔ اس کا باپ کہتا ہے اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ وقت گزرنے کے بعد صدمے کی کیفیت سے نکل آئے گی۔"

اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔ اماں ہر آنے والے کے آگے یہی دکھڑا لے بیٹھتی تھیں کہ ان کی بیٹی زندگی کے ہنگاموں میں حصہ نہیں لیتی اور وہ کیا بتاتی اماں کو کہ جن کی زندگی ہی محبت ہو اور وہ چھن جائے تو پھر زندگی بے سود ہے۔

کتنی راتیں گزر گئیں۔ جو اس کا ہجر اوڑھے آنکھوں میں کٹیں۔ کتنے ہی فراق کے سورج ابھرے اور جدائی کو مستقل کر گئے۔ وہ اک اک سانس کا حساب کرتی رہی جب اس کی یاد نہ آئی ہو۔ اک لمحہ اک پل اک ساعت بھی ایسی نہیں گزری۔ جب اس کے خیال نے ساتھ چھوڑا ہو۔ وہ تو ہمیشہ دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ کتنا چاہا تھا اس نے کہ وہ اس کی یاد سے دامن چھڑالے اس کے خیال کو روند ڈالے پر وہ تو زندگی کی رمق بن کر اس کے دل کو دھڑکاتا رہا۔

اور عنیزہ عارف کی آنکھیں خشک ہونے کو ترس گئیں۔

اس کی نیندیں اس سے روٹھی رہیں اس سے بچھڑ کر پھر سکون میسر نہ ہو سکا۔ وہ بے مراد لمحوں میں جیتی رہی۔ محبت کے لمحوں میں جینے والوں کا ایک ہی المیہ ہوتا ہے کہ زندگی کے ترازو میں ان کے دکھ سکھ، خوشی و غمی کے پلڑے ہمیشہ برابر رہتے ہیں۔ محبت انہیں روحانی خوشی دیتی ہے تو قلبی درد بھی۔ یہ خوش نصیبی اور بدنصیبی ان کے پلو میں ساتھ ساتھ بندھی ہوتی ہے۔

جب اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئے۔ اس کی زبان تالو سے لگی رہی۔ وہ کیا بتاتی اک مرد کے اندھے فیصلے نے اس کے اعتبار کو کرچی کرچی کردیا اور اس نے خوف زدہ ہو کر عجلت میں اس سے بچھڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر وہ تو اپنی ذات سے ہی بچھڑ گئی۔ اپنے آپ سے بھی روٹھ گئی۔ اس کی خاطر مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ اور اس کی دھڑکن جو ہر آنے والے کے قدموں کی چاپ سے بڑھ جاتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ معمول پر آگئی۔

وہ اگر اپنی محبت میں واقعی سچا ہوتا تو ضرور لوٹ کر آتا۔ مگر سیف مصطفیٰ! تم بھی تو نکلے نا ہرجائی۔ میں نے تمہیں چھوڑا تھا تو عورت کے ازلی خوف سے ڈر کر' اس خوف سے جو اس کے پیدا ہوتے ہی لوری کی صورت اسے سنایا جاتا ہے۔ دعاؤں کی صورت اسے بتایا جاتا ہے۔ اس کی آبرو کی حفاظت کی دعا ماؤں کے لبوں پر ہر وقت مچلتی رہتی ہے تو وہ دعا اس کے اندر یوں گڑ جاتی ہے کہ اسے خود سے بھی خوف زدہ کردیتی ہے۔

اس کے باپ نے بہترا چاہا کہ وہ پڑھائی نہ چھوڑے۔ فیروز اسے روزانہ یونیورسٹی لے جائے گا۔ مگر وہ کسی قیمت پر پڑھائی جاری رکھنے پر تیار نہ ہوئی۔ وہ کیسے اس کے ساتھ پڑھ سکتی تھی۔ اس کا اعتبار کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ سیف کو پتا تھا کہ سہیل شادی شدہ ہے وہ صائمہ سے فلرٹ کررہا ہے۔ تو وہ کم از کم مجھے تو بتا دیتا پھر تو شاید صائمہ اس کی محبت میں اتنا آگے نہ بڑھتی۔ مگر اس نے جان بوجھ کر یہ بات چھپائی۔ وہ مرد ہے اس نے ایک مرد کو عورت کا شکار کرنے کی اجازت دے دی۔ تو میں کیسے اس پر اعتبار کرلوں' اس نے میرے اعتماد کو خود اپنے پاؤں تلے روندا ہے۔ وہ جب بھی سوچتی پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اس کا تکیہ ہمیشہ اس کے آنسوؤں کی اوس سے گیلا ہوتا۔

مگر وہ دل سے نکلتا کیوں نہیں۔ لاکھ اسے جھٹلاؤں' بھلے اس پر اعتماد نہ کروں۔ وہ میرے لہو میں دوڑتا ہے جان بن کر۔

اس بار خاندان کی شادی میں جب پھپھو ناہید کی بیٹی نے اس سے کہا "چلو لاؤس' دیکھنے چلیں" تو اس نے اداس مسکراہٹ سے کہا۔

"مجھے اپنا بر ڈھونڈنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے' خاندان کے لڑکے بھی اس رسم پر جمع ہوتے ہیں۔ لڑکی پسند آئے تو جھٹ رشتہ بھیج دیتے ہیں۔"

وہ اس کی باتوں پر ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔

"ہائے مائی عائشہ! کسی نے تیری بیٹی پر تعویذ تو نہیں کردیے۔" پھپھو ناہید کی اکلوتی نند نے نیا شوشہ چھوڑا تھا۔

وہ خیالات کی دنیا سے واپس آئی۔ صحن میں ہلکی ہلکی دھوپ سینکتے ہوئے برآمدے میں دیکھا جہاں تخت پر بیٹھی دو رشتے دار عورتیں اماں کو نئی نئی پٹیاں پڑھا رہی تھیں۔

"محبت سے بھی بڑا کوئی تعویذ ہے بھلا۔" وہ دکھ سے مسکرائی۔

"ہاں ادی ہاں! کسی نے کالا جادو تو نہیں کردیا۔ اللہ مارے ان موئے بھیلوں اور بھوپوں کو۔ ظلم کردیا ہے انہوں نے۔" دوسری عورت نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"محبت کا اتنا بھیانک روپ دیکھا میں نے کہ جس کے آگے کالا جادو بھی کچھ نہیں۔" وہ تلخی سے سوچنے لگی۔

"ہائے ادی! اس طرف تو میرا خیال ہی نہیں گیا۔ بھلا میری تو کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے۔" وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

"ای ادی دشمنی کا کیا کہتی ہو' یہاں تو لوگ خوامخواہ سامنے (سبز خوشحال۔) کو ہستے نہیں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ بھوکے کو دیتے نہیں۔"

"اب اماں ان کی باتوں میں آ رہی ہیں مجھے کہاں کہاں گھسیٹتی پھریں گی۔" یہ سوچ کر ہی اسے کوفت ہو رہی تھی۔ یہ مائیں بھی بس کبھی مطمئن نہیں ہوتیں۔

✿ ✿ ✿

انہیں گاؤں میں آئے تیئیس سال ہو چکے تھے جب وہ آخری بار ماں کی وفات پر آئے تھے۔ خان محمد حالیہ راستوں سے واقف تھا۔ وہ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ پچھلی سیٹ پر مریم اور سیف امید و بیم کی کیفیت میں گھرے بیٹھے تھے۔ سالوں کے ٹوٹے رابطے بحال ہوں گے یا نہیں؟ شکوک کنڈلی مارے ان کے درمیان بیٹھے تھے۔

مکیں اور مکاں بدل چکے تھے۔ گاؤں کی رونق اور اسکول بھی ان کو نظر آیا تھا۔

وہ گیٹ سے اندر داخل ہوئے' رئیس عارف نے حیرت سے غلام مصطفیٰ کو آتے دیکھا۔

"تم... تم غلام مصطفیٰ!" وہ آگے بڑھے اور وہ بھی بڑھ کر ان کے گلے لگ گئے۔

"بھا... بھلی کرے آئیں۔" وہ آبدیدہ ہو گئے۔ چھوٹے بھائی کے لیے دل میں سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھی انہیں گلے لگائے ان کی پشت پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

دونوں بھائی اب عمر کے اس دور میں ماضی کی سب تلخیاں بھلا چکے تھے۔

"اوا! یہ بیٹا ہے میرا۔ سیف۔"

رئیس عارف نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے اسے گلے لگایا۔

"تیرا بیٹا ہے تو میرا بھی بیٹا ہے۔"

"ہاں' یہ بالکل ٹھیک بات کی آپ نے۔" وہ ہنسے۔

"آ جاؤ۔ بھا جائی۔ آ جاؤ اندر آ کر بیٹھو۔ ہم خوشی میں باہر ہی کھڑے باتیں کررہے ہیں۔"

"اوا! جاڑے کی دھوپ بھی گرم نہیں لگتی۔"

"ہاں کہتے تو ٹھیک ہو غلام مصطفیٰ!"

سیف دھڑکتے دل کے ساتھ چاروں طرف نظریں گھما کر جیسے کچھ ڈھونڈنے لگا۔

"بھا جانی! ابھی سے ملواؤ نا!" مریم نے بے صبر ہو کہا۔

"عنیزہ تو ذرا شرمیلی ہے۔ عنیزہ کو بلاتی ہوں۔"

"عنیزہ بیٹی! تم بیٹھو میں بلاتا ہوں۔ عنیزہ کو۔"

رئیس عارف برآمدے میں بیٹھے آوازیں دینے لگے۔

"عنیزہ بیٹا! آؤ دیکھو کون آیا ہے۔"

وہ باہر آئی تو سیف کو دیکھ کر ایک لمحے کو جیسے دل کی دھڑکن رک گئی۔

سیف اسے دیکھ کر متذبذب کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ عائشہ نے غور سے بیٹی کو دیکھا اور پھر سیف کو، جس کی اوڑی آنکھیں عنیزہ پر مرکوز تھیں۔ مریم ہنس کر آگے بڑھیں۔

"تو یہ ہے ہماری بیٹی!" غلام مصطفیٰ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بیٹا! یہ تمہارے چاچا، چاچی ہیں اور یہ ان کا بیٹا سیف۔" وہ قدرت کی مہربانی پر خوشی و حیرت کے ملے جلے جذبات سے ان کو دیکھتی رہی۔

"عنیزہ آئے تو لے لوں ناہید کو لینے بھیجوں، بڑا یاد کرتی ہے تمہیں۔"

"ادا! ہم خود چلیں گے سب مل کر ان کے ہاں۔ ہم دونوں کو اکٹھے دیکھ کر وہ کتنا خوش ہوں گی ذرا سوچیں۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" رئیس عارف ہنسے۔

وہ آنکھوں کی نمی کو چھپانے کے لیے چائے کے بہانے اٹھ گئی۔ سیف کی نظروں نے باورچی خانے تک اس کا پیچھا کیا۔

"چائے بنانے میں ہمارا بڑا بیٹا بھی ماہر ہے۔ اس کے باپ کو تو میرے ہاتھ سے زیادہ اس کے ہاتھ کی چائے پسند آتی ہے۔ سیف! تم جاؤ، چائے بنانے میں عنیزہ کی مدد کرو۔" مریم نے اس کی مشکل حل کی۔ وہ مسکراتے ہوئے اندر آیا۔ عنیزہ کی پشت تھی اس کی جانب۔

لوگ کہتے ہیں عشق کا رونا
گریہ زندگی سے عاری ہے
پھر بھی بے مہار جذبہ دل
عقل کے فلسفوں پہ بھاری ہے
آپ کو اپنی بات کیا سمجھاؤں
روز بجھتے ہیں حوصلوں کے کنول
روز کی الجھنوں سے ٹکرا کر
ٹوٹ جاتے ہیں دل کے شیش محل
لیکن آپس کی تند و تیز باتوں پر
سوچتے ہیں خفا نہیں ہوتے
آپ کی صنف میں بھی ہے یہ بات
مرد ہی بے وفا نہیں ہوتے

وہ اس کی پشت پر کھڑا نظم پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی نمی کو راستہ مل گیا۔

"آخر میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا نا۔ بے وفا لڑکی۔"

بچھڑا جو تو وجود میرا لخت لخت تھا
تو میری زندگی بھی تھا تو میرا بخت تھا

اس نے ہاتھوں کی پشت سے مسکرا کر آنسو پونچھے۔

"ہو نا بے وقوف لیلاں کی طرح۔"

"جی نہیں، وفادار ماروی کی طرح۔"

"آدھی لیلاں کی طرح۔ آدھی ماروی کی طرح۔"

وہ دونوں ہنس پڑے۔

اور باہر رئیس غلام مصطفیٰ نے بڑی آس سے اپنی جھولی بھائی کے آگے پھیلا دی تھی۔ اور رئیس عارف جو اس کے مقروض تھے کیسے انکار کرتے۔

"عنیزہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔ غلام مصطفیٰ!" انہیں آتے دیکھ کر بات بیچ میں ہی چھوڑ دی۔

"بھئی۔ بڑی دیر کر دی چائے لے کر آنے میں۔ تم لوگوں کو پتا نہیں بروہی (بلوچ) زیادہ دیر چائے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔" وہ سب ہنس پڑے۔

"چاچا جانی! ہم نے اسپیشل چائے بنائی ہے اس لیے دیر ہو گئی۔" سیف چہکا۔

"ابھی پتہ چل جائے گا چکھنے کے بعد۔"

"اس سے پہلے کہ بابا آپ کو چائے اچھی نہ لگے اور آپ ہمیں ڈانٹیں، میں تو چلی گلاب کو پانی دینے۔" وہ اٹھ کر صحن کے کونے میں گلاب کے پودوں کو پانی دینے لگی۔

"اور سیف! تم یہاں کیا کر رہے ہو، ذرا جاؤ، ہماری بچی کا ہاتھ بٹاؤ اور ہاں اس سے یہ ضرور پوچھنا کہ پڑھائی کیوں چھوڑ دی؟" وہ باپ کے کہنے پر خوش دلی سے اٹھ گیا۔

"غلام مصطفیٰ! اب تو کوئی پریشانی اسے نہیں ہو گی۔ جو اس کا اپنا گھر ہو گا۔"

"ہاں صحیح ہے ادا! اپنے گھر میں بھلا کون ڈرتا ہے۔"

"لگن اور لگاوٹ میں فرق ہوتا ہے۔ پاگل لڑکی! لگن لگ جاتی ہے اور لگاوٹ لگانی پڑتی ہے۔"

وہ گلابوں کو پانی دے رہی تھی اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

"لگن چھوٹتی نہیں، لگاوٹ قائم نہیں رہتی۔"

"لگن من سے وابستہ ہوتی ہے اور لگاوٹ تن سے۔ لگن اندر ہی اندر سلگاتی رہتی ہے۔ لگاوٹ چنگاری کی طرح جل کر بجھ جاتی ہے۔"

وہ بنا مڑے مسکرا کر آگے بڑھتی رہی۔

"لگن بندے کے اندر درختوں کی طرح جڑیں پکڑتی ہے اور لگاوٹ ٹہنیوں کی مانند خشک ہو کر سوکھ جاتی ہے۔ لگن باطنی جذبہ ہے اور لگاوٹ ظاہری جذبہ۔"

"بس بس، کافی ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ہنستے ہوئے اسے روکا۔ سیف نے جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گھور کر اسے مصنوعی ناراضی سے دیکھا۔

"آیا یقین اور لگن اور لگاوٹ کے فرق کا بھی پتہ چل گیا۔"

"ارے ہاں میں تمہارا وہ سوٹ لایا ہوں جو تم نے کہا تھا کہ جب اماں کو لے کر آؤں گا تو تم پہنو گی۔ منگنی میں پہنو گی یاد ہے؟"

اس نے گھور کر مصنوعی خفگی سے دیکھا۔

"دیکھو تم نے ہی کہا تھا۔" وہ شرارت سے بولا۔

رئیس عارف نے دور سے بیٹی کو دیکھا جس کے لبوں پر مسکراہٹ بہت عرصہ بعد دیکھی تھی۔ دھوپ کی تمازت اب ڈھلنے لگی تھی اور سنہری شام کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ہر دل اپنی جگہ مطمئن تھا۔ ایک مدت بعد بچھڑے ملے تھے۔ سب کو بے پناہ خوشی تھی کہ غلام مصطفیٰ نے اپنی ضد توڑ دی اولاد کی خوشی کی خاطر۔

اور رئیس عارف نے مسکرا کر سوچا جیسے کچھ نہ کچھ تو ازالہ کر دیا اس کی جھولی میں اپنی بیٹی ڈال کر۔

زندگی ان ہی غلطیوں، کوتاہیوں اور خوشیوں سے عبارت ہے مگر وقت جب ازالہ کرنے کی دعوت دے تو خوش دلی سے وہ دعوت قبول کر لینی چاہیے۔

قدرت کی مہربانی سے زندگی نے اپنے آنچل میں بندھی ساری خوشیاں ان پر نچھاور کر دی تھیں۔

سیف کی ہنسی عنیزہ کے قہقہوں کو واپس بلانے لگی۔

سورج نے سرشاری سے دیکھا اور مغرب کی طرف کروٹ بدل کر آنکھوں سے اوجھل ہوا۔

اور سنہری شام اٹھلاتی ہوئی ان کے آنگن میں اتر آئی۔

*